طلوع اسلام

May-37

زیرِ ادارت سید نذیر نیازی

فہرست مشمولات

تصویر پادشاہِ اسلام اعلحضرت ظاہر شاہ المتوکل علی اللہ

صدر کانگریس سے
از سید نذیر نیازی

ضرب کلیم اور احمدیت
از پروفیسر یوسف سلیم چشتی

دو مصری شاعر
از سید نصیر احمد

سیاحت اندلس * * ایک اہم مسئلہ
* * دہلی عہد اکبر شاہ ثانی *

غرناطہ

اور

اقتباسات و مراسلات

مئی ۱۹۳۷ء

SAHIH-AL-BUKHARI

is now accessible to the English knowing world.

Based on an intensive study of the Arabic language, early Islamic history and the Hadith-literature. With *Explanatory Notes* to help the reader to understand Islam. The chain of the narrators (Isnad) has been fully reproduced. An exhaustive *Index* will be added at the end.

Printed on high quality antique paper with complete Arabic Text in 30 parts of 120 pages each.

BY

MOHAMMAD ASAD (Leopold Weiss)

Subscription Rates	*Inland*	**Rs. 2/8/- per part**
	Foreign	**Sh. 4/-** ,,
	Postage Extra.	

ISLAM ON THE CROSSROADS

BY

MOHAMMAD ASAD

(Leopold Weiss)

A BOOK EVERY MUSLIM MUST READ.

Sir Mohammad Iqbal says—

This work is extremely interesting. I have no doubt that coming as it does from a highly cultured European convert to Islam it will prove an eye-opener to our younger generation.

Price Rs. 2/- net.

To be had of—

The Manager,

KITAB KHANA TULU-E-ISLAM

25, McLeod Road, LAHORE.

ترجمانِ حقیقت حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہٗ کا تازہ مجموعہ کلام اردو

ضربِ کلیم

یعنی

اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف اور مسلمانوں کیلئے ایک نئی دعوتِ فکر

ضربِ کلیم مختلف ابواب میں منقسم ہے مثلاً

اسلام اور مسلمان، تعلیم و تربیت، عورت، فنونِ لطیفہ اور

محرابِ گل افغان کے افکار

جو فرزندانِ کوہستان کے لئے حیاتِ تازہ کا پیغام لائے ہیں

قیمت مجلّد، دو روپے۔ علاوہ محصول ڈاک

خاص جلد حسبِ فرمائش ڈھائی تین اور پانچ روپے

بانگِ درا	اور جاوید نامہ	بالِ جبریل
تین روپے	تین روپے	تین روپے

اس کے علاوہ ہر قسم کی علمی ادبی کتابیں

کتاب خانہ طلوعِ اسلام، ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور سے طلب فرمائیے

(سول ایجنٹس ضربِ کلیم)

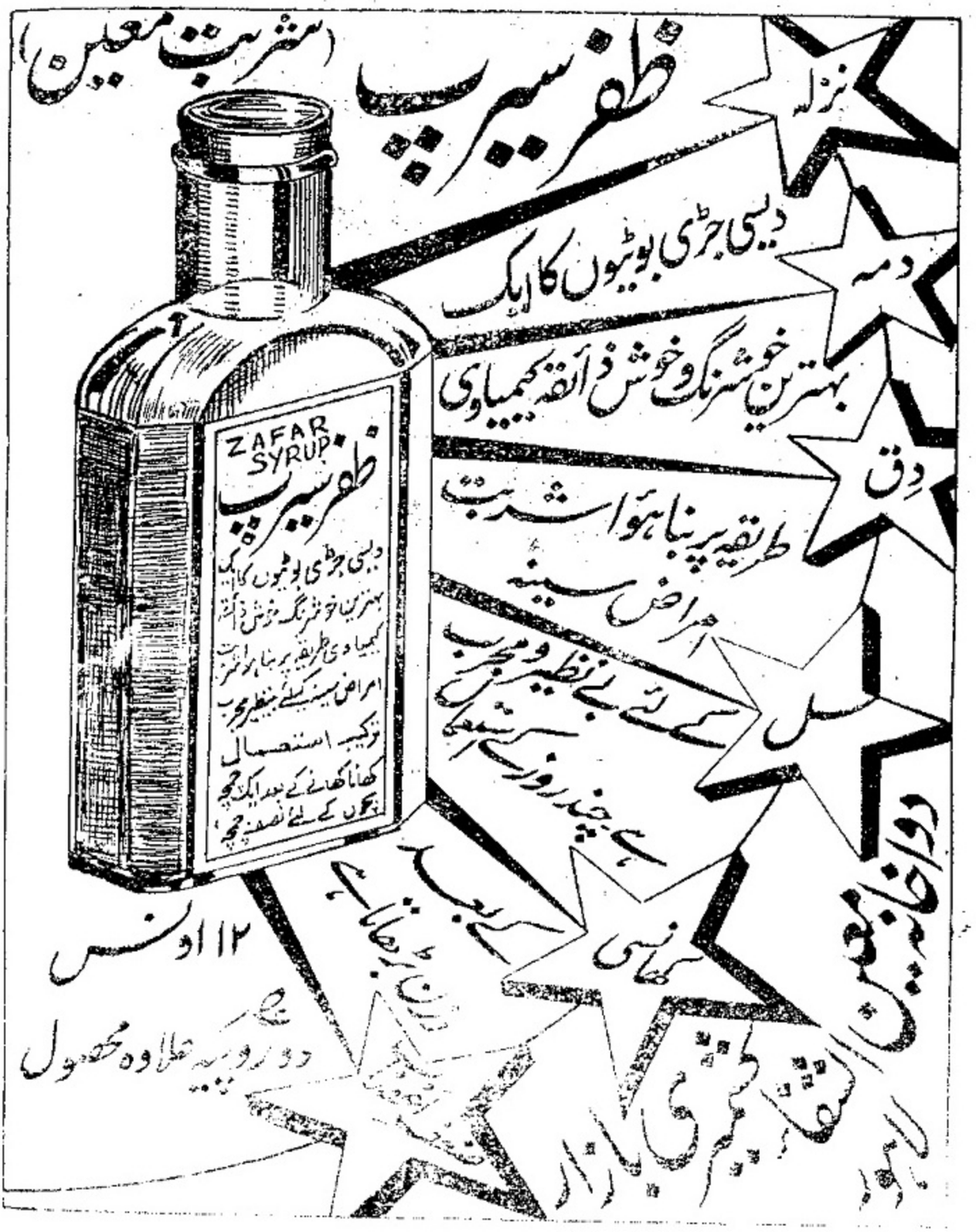

(شربت معین)
ظفر سیرپ
نزلہ
دمہ
دق
سل
کھانسی
دیسی جڑی بوٹیوں کا ایک
بہترین خوشرنگ و خوش ذائقہ کیمیاوی
طریقہ پر بنا ہوا شربت
امراض سینہ
کے لئے بے نظیر و مجرب
ہے چند روز استعمال
ZAFAR SYRUP
ظفر سیرپ
دیسی جڑی بوٹیوں کا ایک بہترین خوشرنگ و خوش ذائقہ کیمیاوی طریقہ پر بنا ہوا شربت امراض سینہ کیلئے بے نظیر مجرب
ترکیب استعمال
کھانا کھانے کے بعد ایک چمچہ
بچوں کے لئے نصف چمچہ
۱۲ اونس
دو روپیہ علاوہ محصول

طلوع اسلام

ایک ماہوار رسالہ مشتمل بر حیاتِ ملیہ اسلامیہ

زیر ادارت سید نذیر نیازی

مدیر معاون سید نصیر احمد بی۔ اے

مئی ۱۹۳۷ء

جلد ۱ — عدد ۶

قیمت

سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
پانچروپے	تین روپے	آٹھ آنے

معہ محصول ڈاک

اشتہارات کے نرخ اور مزید تفصیلات کے لئے مہتمم سے خط و کتابت فرمائیے

مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ میں چھپا اور سید نذیر نیازی طابع و ناشر نے

دفتر طلوع اسلام۔ ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور

سے شائع کیا

فہرست

تصویر اعلیٰ حضرت پادشاہِ اسلام ظاہر شاہ المتوکل علی اللہ فرمانروائے دولت افغانستان ایدہ اللہ بنصرہ العزیز

تاثراتِ بیانی		۵
کچھ طلوعِ اسلام کے متعلق		۷

مقالات

صدر کانگریس سے	سید نذیر نیازی	۹
ایک اہم مسئلہ	ادارہ	۱۷
ضربِ کلیم اور احمدیت	پروفیسر یوسف سلیم چشتی پرنسپل اشاعت اسلام کالج لاہور	۳۶
دہلی عہد اکبر شاہ میں	شیخ محمد اکرام، آئی سی ایس اسورت ۔	۵۵
سیاحت اندلس	مولوی غلام یزدانی ایم اے، او بی ای حیدرآباد	۶۴

رجال و مشاہیر

دو مصری شاعر	سید نصیر احمد بی ۔ اے	۲۵

آثار و مقامات

غرناطہ	مقتبس	۳۳

مراسلات و استفسارات

مسلمانوں کی آمدنی اور خروج	اقتباس از خطبہ صدارت جناب پروفیسر الیاس برنی	۴۷
پاکستان	ایم ۔ اے حق صاحب، لندن	۸۰
ضربِ کلیم کا گجراتی ترجمہ	مقتبس	۸۱

اعلیحضرت پادشاه اسلام ظاهر شاه
المتوکل علی الله - فرمانروائے دولت مستقله
افغانستان - خلد الله ملکه

تاثراتِ یمانی

شہدا

مقامِ عرشِ معلیٰ سے ہے بلند ان کا — جو لوگ مرگِ مفاجات سے نہیں ڈرتے
کہو نہ مردہ کہ ہیں زندۂ ابد وہ لوگ — جو مر کے راہِ خدا میں کبھی نہیں مرتے

مثالِ صاعقہ مٹتے ہیں یا مٹاتے ہیں
صفِ قتال سے اصلا حذر نہیں کرتے

قوتِ بازو

سنو سنو وطنِ زار کے ہوا خواہو — پیام لایا ہے اوجِ فلک سے روح امیں
نہیں ہے باعثِ توقیر دولتِ دنیا — شمارِ بیش سے قومیں نہیں ہیں اوج نشیں
ضیائے علم و ہنر سے نہیں ہے کسبِ کمال — حدیثِ سبحہ و زنار سے فروغ نہیں

مدارِ سطوتِ قومی ہے قوتِ بازو
بھرا ہو دل میں اگر خونِ برق وار یقیں

ترکِ تقلید

دشتِ گمراہی میں ہوں گر رہ نورد اچھا ہوا — جادۂ تقلید پر چلنے سے کیا حاصل مجھے
مجھ کو سرگشتہ نہیں رکھتی تلاشِ رہنما — یہ دلِ راز آشنا ہے رہبرِ کامل مجھے

مجھ کو گردابِ بلا میں ہے سلامت کا یقیں
قعرِ دریائے حوادث ہے لبِ ساحل مجھے

یمانی

فلسفہ عجم

حضرت علامہ اقبال مدظلہ کی مشہور انگریزی تصنیف

Development of Metaphysics in Persia

کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ از میر حسن الدین صاحب وکیل حیدرآباد

علامہ اقبال مدظلہ کی یہ تصنیف انگریزی میں بھی نایاب تھی - یہ وہی کتاب ہے جس کی یورپ کے علماء فضلاء اور علمی حلقوں نے غیر معمولی تعریف کی - اور جس پر علامہ موصوف کو فلسفہ میں ڈاکٹری کی ڈگری عطا ہوئی - قیمت دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک + قیمت مجلد تین روپے

تاریخ الامّت

یعنی مکمل تاریخ اسلام سات جلدوں میں از مولانا اسلم جیراجپوری استاد جامعہ

قیمت - بارہ روپے - علاوہ محصول ڈاک

خطبات خالدہ ادیب خانم

یعنی ترکی میں مشرق و مغرب کی کشاکش کی تصویر خالدہ ادیب خانم دور حاضرہ کی مشہور ترکی خاتون کے قلم سے - قیمت - دو روپے - علاوہ محصول ڈاک +

کتاب خانہ طلوع اسلام - ۲۵ میکلوڈ روڈ - لاہور

کچھ طلوعِ اسلام کے متعلق

طلوع اسلام کی ابتدا اکتوبر ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ فروری ۳۶ء سے اس کی باقاعدہ اشاعت کا اہتمام کیا گیا۔ لیکن آخر مارچ میں جب رسالے کا دفتر بوجوہ لاہور منتقل ہوا۔ تو حالات اس قدر نامساعد تھے کہ اگست سے پہلے کوئی پرچہ شائع نہ ہو سکا۔ اس کے بعد صرف ایک نمبر اور نکلا۔ اسوقت سے لے کر اب تک طلوع اسلام کا مستقبل کچھ اس حد تک مشتبہ اور غیر متیقن رہا کہ ہم اسکے متعلق کوئی اعلان نہ کر سکے۔ یہ ایک ایسی فروگزاشت تھی جو قارئین کے لئے بے جا انتظار اور تکلیف کا باعث ہوئی اور جس کے لئے ہم افسوس کے ساتھ ان سے معذرت چاہتے ہیں۔

ہندوستان میں اسلامی صحافت کی زبوں حالی مسلم ہے۔ قوم کو شکایت ہے کہ ہمارے رسائل و جرائد کا معیار نہایت درجہ پست ہے اور ان کے متعلق کسی قسم کے اعتماد یا حسن ظن سے کام لینا غلطی ہے۔ رسائل و جرائد کو گلہ ہے کہ قوم کی طرف سے ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ اس صورت حالات سے مایوس ہو کر بہت سے ہونہار اور پرجوش نوجوانوں کا قلم اخبار کے پراپیگنڈے میں مصروف ہے اور ان کی بجائے میدان ان قسمت آزماؤں کے ہاتھ میں ہے جن کی ساری کامیابیاں محض حسنِ اتفاق سے وابستہ ہیں۔ یہ امر تقریباً ناممکن ہو چلا ہے کہ مسلمان سرمائے یا عمل کے اشتراک سے صحافت میں کوئی اہم اقدام کر سکیں۔ صحافت سے ہٹ کر طبع و نشر کا جائزہ لیجئے تو یہ نہایت ضروری اور اہم فن بھی اسی کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ ایک طرف ہمارا ذوقِ جمال نستعلیق سے کم کسی دوسرے طرز خط پر راضی نہیں ہوتا۔ دوسری جانب ہماری روزمرہ طباعت و کتابت جو نومشق کاتبوں، مسالے سے رنگے ہوئے کاغذ اور پتھر یا پلیٹ اور ان کے مصححین۔ یعنی لیتھو کے ذریعے نقل پذیری کی محتاج ہے، اس قدر ناقص، اس قدر بھدی بدشکل اور جدید طریقہ ہائے طباعت سے یہاں تک محروم ہے کہ اس کے دیکھتے ہوئے خود اردو کی آئندہ ترقی مخدوش نظر آتی ہے۔ اب اس مثلث کے تیسرے اور سب سے زیادہ اہم ضلع یعنی مطالعہ کے شوقین حضرات کی طرف آئیے۔ اول تو ہمارا ان پڑھ طبقہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کے مقابلے میں شائقین علم کی تعداد نہایت حقیر نظر آتی ہے۔ ان میں بھی زیادہ تر رواج استعمار خوانی یعنی بغیر دام صرف کئے پڑھنے کا ہے۔ بفرض محال اگر ان کا ارادہ کچھ صرف کرنے کا

ہوا بھی تو ان کی تسکینِ خاطر کے لئے افسانہ و غزل اور سلوقیانہ ظرافت کا ایک انبار پہلے سے موجود ہے۔ یا پھر نہایت سطحی مبتذل اور متعصبانہ ادب کی مانگ ہے۔ جس میں ہم اپنے نظریہ ہائے فن اور فلسفۂ مذہب کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے ماورا ایک نہایت قلیل جماعت افرنجیت مآب اہم علم کی ہے۔ ان کو یا تو اردو سے مس ہی نہیں اور ہو بھی تو اسلامی تاریخ و تمدن یا اس کے مسائل و مباحث کا تذکرہ اس کے نزدیک ترقی اور روشن خیالی سے بعید ہے۔

غلامی اور محکومیت کچھ مسلمانوں ہی سے مخصوص نہیں۔ اس دیس کی اور قومیں بھی اسی لعنت میں گرفتار ہیں مگر ہمارے اور ان کے درمیان ایک فرق ہے۔ وہ مستقبل کا ایک واضح تصور رکھتی ہیں۔ ان کا ایک اجتماعی نصب العین ہے اور وہ اپنے مقاصد حیات کے لئے ایثار اور ہمت سے جد و جہد کر سکتی ہیں۔ برعکس اس کے ہمارا سواد اعظم افلاس اور جہالت کی نذر ہو چکا ہے۔ امرا سے یہ توقع نہیں کہ وہ ان کی دستگیری کریں۔ اس لئے کہ انہیں اپنے لذائذ نفس اور دنیا طلبی ہی سے فرصت نہیں ملتی کہ ضروریاتِ قومی کی طرف متوجہ ہوں۔ نصف صدی سے زیادہ مدت گذر گئی جب ہماری حکومت و ثروت کا آخری نقش مٹا ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک نہ جماعت نے کوئی رہنما پیدا کیا نہ رہنماؤں نے کوئی جماعت۔ ہاں ایک جوش ہے جس کا اظہار کبھی کبھی ہو جاتا ہے مگر جس کے باوجود ہماری رفتار سفر میں کوئی فرق نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے ہاں جو کچھ ہے محض تکلف، تصنع اور منافقت۔ یہ صورت حالات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ فساد اور ہلاکت کا وہ مادہ جو ہمارے وجود ملی میں اندر ہی اندر پک رہا ہے ایک نہ ایک دن ضرور پھوٹیگا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے نتائج کسقدر خوفناک ہونگے۔ ان حالات میں دوستوں کا گلہ یا قوم کی بے اعتنائی کا شکوہ بیسود ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب بے حسی اور جمود کا یہ عالم ہو تو افراد کے لئے باوصف کوشش انجاحِ مقاصد نہ سہی خود اپنی زندگی کا ایک مخصوص تصور کہاں تک ممکن ہے۔

لہٰذا اطلوعِ اسلام کا مکرر اجرا ایک قسم کی جسارت ہے۔ جسکا ہمیں خود بھی اقرار ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کی زندگی کا نیا دور کیا صورت اختیار کرتا ہے۔

نیازی

صدر کانگریس سے

سید نذیر نیازی

ایک زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو سے مسلمانوں کو خاص عقیدت تھی۔ خیال یہ تھا کہ "نوجوان" اور "متمدن" ہندوستان کو جس آزاد مسلک اور وسیع النظر قائد کی ضرورت ہے اسے پنڈت جی کی ذات بدرجۂ اتم پورا کریگی۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے کانگریس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو امید ہو چلی تھی کہ وہ اس ملک کے بنیادی مسائل پر مدبرانہ نظر ڈالینگے اور ان کی راہنمائی میں انڈین نیشنل کانگریس ایک ایسی روش اختیار کریگی جو ہندوستان کی متعدد اور مختلف قوموں میں اتحاد و اتفاق کا باعث ہوگی۔ بدقسمتی سے پنڈت جی اور ان کے رفقائے کار نے اپنے لئے وہ راستہ پسند کیا جو ہمارے اجزائے سیاست میں روز افزوں انتشار اور تصادم کا باعث ہو رہا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ کل اس کے نتائج کسقدر مہلک اور خطرناک ہونگے

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں پنڈت جواہر لال نہرو کے جذبۂ خدمت وطن یا حصول آزادی سے انکار ہے۔ ہمارے نزدیک ان کی ساری زندگی ایثار و فدویت کی ایک روشن مثال ہے۔ وہ اپنے دل میں ہندوستان کی غریب اور فاقہ آبادی کا حقیقی درد رکھتے ہیں اور ان کی عزیز ترین خواہش یہ ہے کہ ہمارے نظام سیاست و معیشت میں کوئی خوشگوار تبدیلی رونما ہو۔ انہوں نے اس راہ میں بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں اور ان کے بے پایاں خلوص اور زبردست حب قومی کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ حقیقت میں ان کی غیر معمولی شخصیت کا یہی پہلو ہے جو ہمیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ اسلامی ہندوستان کو ان سے جن باتوں میں اختلاف ہے بلاکم و کاست ان کی خدمت میں عرض کر دی جائیں۔

پنڈت جی کی دو شخصیتیں

ہماری رائے میں پنڈت جی کی نہایت درجہ دی اثر اور متحرک ذات میں دو شخصیتیں جمع ہیں۔ ایک شخصیت اشتراکی جواہر لال کی ہے۔ جو سر سے لیکر پاؤں تک تہذیب مغرب کی پیداوار ہے اور جس کے عزائم و مقاصد کی تشکیل میں ہندوستان کی قدیم روایات یا ہندو مذہب نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ دوسری شخصیت سیاسی جواہر لال کی ہے جو انڈین نیشنل کانگریس کا صدر اور "ہندی قومیت" کا نوجوان راہنما ہے۔ اشتراکی جواہر لال کی نظر ہمیشہ ماسکو پر رہتی ہے۔ وہ مذہب کا پرزور مخالف

تاریخ کی مادی اور معاشی تعبیر کا زبردست حامی اور اشتراک و اشتمالیت کے لئے مجنونانہ تعصب رکھتا ہے۔ برعکس اس کے سیاسی جواہر لال کی توجہ اتحاد اور جمہوریت (Democracy) پر ہے۔ وہ اپنی اشتراکیت کو محض اپنی ذات تک محدود رکھتے ہوئے بنارس کے سرمایہ دار اور غیر مساویانہ نظام جماعت سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ وہ گاندھی اور مالویہ کا حلیف، قومیت و وطنیت کا طرفدار اور مشین کی بجائے چرخے کا موید ہے۔ اشتراکی جواہر لال کے اجتماعی نظام میں اختلاف مسلک کی مطلق گنجائش نہیں۔ وہاں صرف ایک ہی اصول کی کارفرمائی ہے اور ہمارا فرض ہے کہ طوعاً و کرہاً اس کے لئے اپنے ہر اصول کو نظر انداز کر دیں لیکن سیاسی جواہر لال ہندو اکثریت کی مجتمع ہستی کو اپنے مزعومہ انقلاب کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ گویا پنڈت جی کی ان متضاد و متبائن حیثیتوں کے باوجود جہاں اکثریت کے سیاسی تغلب اور غصب و اجارہ داری میں کوئی فرق نہیں آتا وہاں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی ہستی اور مذہب دونوں خطرے میں ہیں۔ یہ اس لئے کہ کانگریس کی راہنمائی میں بدقسمتی سے اشتراکی یعنی مغربی جواہر لال پر سیاسی یعنی ہندو جواہر لال کا غلبہ ہے اور وہ بھی اس عجیب و غریب مغالطے کی بنا پر کہ سردست شہنشاہیت کا مقابلہ جمہوریت ہی کے ذریعے ممکن ہے اور جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ اس ملک کی تمام قوموں سے انکار کرتے ہوئے صرف ایک خیالی یعنی "ہندوستانی قومیت" کا وجود تسلیم کیا جائے

اشتراک یا قومیت؟

لہٰذا پنڈت جی کے لئے اگر انہیں حقیقتاً وسعت و رواداری کے ساتھ تمام ہندوستان کی راہنمائی منظور ہے۔ صرف ایک ہی راستہ ہے انہیں چاہئے کہ اپنے لئے اشتراکیت و قومیت میں سے ایک چیز منتخب کر لیں۔ ان کا یہ دعویٰ بہرکیف غلط ہے کہ ہندی قومیت کے سیلاب میں جمہور یعنی اکثریت کا اتحاد ایک اشتراکی ریاست کی تاسیس میں پہلا قدم ہے۔ اول تو وہ اشتراکیت جو "ہندی قومیت" کی رہین منت ہے اشتراکیت نہیں بلکہ ایک قسم کی فیشٹائیت ہے اس لئے کہ جس قومیت کی تشکیل دوسری قومیتوں کے انکار پر مبنی ہو۔ درانحالیکہ اس کا اپنا کوئی وجود نہیں وہ اقلیتوں کے معاشی مفاد کو کیونکر تسلیم کریگی۔ ثانیاً اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ جب اکثریت اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تو متوسط طبقے کا "بورژوا" ہندو جو بجائے خود کانگریس ہے اپنی سرمایہ دارانہ ذہنیت کو چھوڑ کر دفعتہً اشتراکیت کا جامہ پہن لیگا۔ لیکن اگر اس بات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی ایک اعتراض باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ جب تک پنڈت جی کا اشتراکی انقلاب مترتب نہیں ہوتا مسلمان کیا کریں۔ کیا اس خیالی جنت کا دلکش تصور ان کی معاشی ضروریات کے لئے کافی ہے؟ اس حقیقت سے تو پنڈت جی کو بھی انکار نہیں ہوگا کہ ہندوستان میں جماعتی طبقات کی کثرت ہے

اور مسلمان مذہبًا نہ سہی کسی دوسرے لحاظ سے اس طبقے میں شامل ہیں جس کی معاشی پستی کا انسداد نہ چرخے سے ہو سکتا ہے نہ کھدّر سے۔ لہٰذا ہندوستان کی یہ عظیم اشان اقلیت جس کے لئے پنڈت جی کوئی اشتراکی برنامج تجویز نہیں کرتے کیا کرے؟ وہ کہتے ہیں مسلمانوں کو کانگریس میں مدغم ہو جانا چاہئے اور ایسا کہنے میں ان کا روئے سخن دراصل جمہور اسلام سے ہے جنکے پیش نظر قبول انکے سب سے بڑا سوال روٹی کا ہے۔ بہت بہتر مگر یہ بھی تو معلوم ہو کہ کانگریس نے اس روٹی کے سوال ہی میں جمہور اسلام کی کونسی خدمات انجام دی ہیں؟ کیا اس نے اکثریت کی اس مقاطعانہ روش کو جو کاروبار کی دنیا میں صدیوں سے جاری ہے ختم کر کے ہندو مسلم عوام الناس میں رفاقت Comradeship کا کوئی مشترک احساس پیدا کیا؟ پنجاب کے کروڑ در کروڑ زرعی قرضے کے متعلق اس کی کیا رائے ہے؟ جب اکثریت نے اتحاد و جمہوریت کی خاطر اپنی ناجائز منفعت طلبی Profit & earning اور غصب و اجارہ داری سے ہاتھ نہیں روکا تو یہ کیونکر تسلیم کر لیا جائے کہ حصول اقتدار پر اس کا طرز عمل دفعتہً بدل جائیگا بیشک مسلمان ایک اجنبی شہنشاہیت کے زخم خوردہ ہیں لیکن ان کے معاشی مسائل ان کی جداگانہ ذات سے مخصوص ہیں جن کا حل صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے مذہب اور اپنی ضروریات کی روشنی میں اپنے لئے کوئی مناسب راستہ تلاش کریں۔

علیٰ ہذا جہاں ہمیں اس بات کا اقرار ہے کہ ہندوستان کے سیاسی نشو و نما اور آزادی کے لئے اتحاد و جمہوریت شرط ہے وہاں کانگریس کا یہ نظریہ صحیح نہیں کہ ہندوستان ایک ایسے وسیع ملک کے جغرافی اور تمدنی اختلافات سے قطع نظر کرتے ہوئے ہمیں صرف ایک یعنی "ہندوستانی قومیت" Indian-nationalism کا وجود تسلیم کرنا چاہئے۔ یہ اتحاد ہند کی نہایت غلط صورت ہے اور گو بظاہر کانگریس کے اس اعلان سے کہ اقلیتوں کو اپنے جداگانہ سیاسی وجود پر اصرار نہیں کرنا چاہئے فرقہ داری کا سدباب ہو جاتا ہے لیکن چونکہ ہندوستانی قومیت" کا وجود ابھی معرض تخیل میں ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی تشکیل ہو بھی سکیگی یا نہیں لہٰذا کانگریس کے ان الفاظ کی سلبی Negative حیثیت کو چھوڑ کر اگر ایجابی Positive لحاظ سے غور کیجئے تو یہ ایک نہایت ہی لطیف مغالطہ ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ تم اقلیتوں کے وجود کی نفی کر دو۔ باقی کیا رہ جائیگا۔ ہندو اکثریت۔ یہی وجہ ہے کہ چرخے اور کھدّر کی ترویج سے لے کر اچھوت سدھار، ہندی ہندوستانی اور فرقہ دارانہ فیصلے کی مہموں تک کانگریس کی تمام سرگرمیاں محض ہندو مفاد پر مرکوز ہیں۔ اس نے کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کو مفاہمت اور رواداری پر آمادہ کرے۔ اس نے کیا تو یہ کہ کراچی میں ایک قرارداد منظور کی جس کا نام ہے "اساسی حقوق کا اعلان" ۔ حالانکہ اس اعلان اور تاج برطانیہ کے اس منشور میں جو ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کو عطا ہوا۔ سرمو فرق نہیں۔ معلوم نہیں کانگریس نے یہ کیسے فرض

کرلیاکہ اسے ہندوستان میں حاکمانہ Paramount حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اگر کانگریس کو اقلیتوں کے حقوق اور ان کے مستقل وجود سے انکار ہے تو اقلیتوں کو اس کی سیاسی جدوجہد سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کا مطلب تو صرف یہ ہوگا کہ وہ ایک فرقہ وار جماعت ہے جسے دولت برطانیہ کے زیر سایہ ارضِ ہند کی "دیوانی" حاصل کرنا مقصود ہے۔

اندریں حالات ہماری مخلصانہ گذارش یہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنی خدا داد قابلیت اور عزم و تدبر سے کام لیتے ہوئے یا تو ایک اشتراکی پروگرام ملک کے سامنے پیش کریں اور اس امر کی طلق بحث نہ کریں کہ آیا اس پروگرام پر عمل کرنے کے لئے مذہب سے تعلق رکھنا ضروری ہے یا نہیں۔ جن لوگوں کو ان کے پروگرام پر عمل کرنا منظور ہوگا وہ خود اس کا فیصلہ کرلیں گے۔ برعکس اس کے اگر سردست انہیں اشتراکیت سے کوئی سروکار نہیں تو ان کا فرض ہے کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کے جداگانہ وجود اور مستقل حقوق کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے درمیان مفاہمت و مصالحت کی کوئی راہ نکالیں تاکہ ہم اپنی سیاسی جدوجہد میں ایک متحدہ محاذ قائم کرسکیں۔ ان کا موجودہ طرزِ عمل جبر و تحکم کا ہے، اتحاد و یگانگت کا نہیں اور اقوامِ ہند کی رہنمائی کے لئے اتحاد و یگانگت شرط ہے۔

افکار و خیالات کی بحث

ممکن ہے یہاں پہنچ کر پنڈت جی افکار و خیالات کی بحث چھیڑ دیں۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی میں رفتہ رفتہ چند ایسے عقائد اختیار کر لئے ہیں جن کی صحت پر انہیں شدت سے اصرار ہے اور جن کی تبلیغ و اشاعت کو انہوں نے کبھی مخفی نہیں رکھا۔ لیکن عملی اعتبار سے یہاں پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ آیا وہ مصالحت و رواداری کا راستہ پسند کرتے ہیں یا انہیں کسی خاص تحریک کا پھیلانا مقصود ہے۔ یا تو انہیں حقائق کو حقائق سمجھتے ہوئے اختلاف رائے اور اختلاف مسلک کا حق تسلیم کرلینا چاہیئے یا وہ اتحاد و جمہوریت کا نام ترک کر دیں۔ یہ امر بہر کیف واضح ہو جانا چاہیئے کہ ان کا اصل مدعا کیا ہے۔ وہ زبردستی اپنی بات کو لوگوں سے منوانا چاہتے ہیں یا انہیں موقع دینگے کہ اگر ان کا جی چاہے تو رضامندانہ ان کی طرف بڑھیں۔ پہلی صورت میں ان کا طرزِ عمل ایک قسم کا اعلانِ جنگ ہوگا مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ہر اس شخص کے لئے جو ان سے اختلاف رکھتا ہے۔ دوسری صورت میں ان کا فرض ہے کہ ملک کے سامنے کوئی اشتراکی لائحہ عمل پیش کریں اور اس بات کے منتظر رہیں کہ لوگ اس کے متعلق کیا رائے قائم کرتے ہیں۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ پنڈت جی نے اشتراکیت کے بارے میں جب کبھی گفتگو کی ہے نظری حیثیت سے کی ہے۔ وہ قومیت کو اپنے اشتراکی انقلاب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ قومیت و اشتراکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا

ہنگامہ بحث و استدلال ہر مرتبہ ایک نئی بے اعتمادی اور تلخی کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ پنڈت جی کا یہ عام انداز ہے کہ وہ اپنے خیالات کی تردید و تنقیص کو ذرا سی دیر کے لئے بھی برداشت نہیں کرتے۔ برعکس اس کے علمی اور نظری گفتگو کے لئے اس امر کا اعتراف ناگزیر ہے کہ ہمارے نقطۂ نظر کے علاوہ دوسرے نقطہائے نظر بھی موجود ہیں۔

جہاں تک ہم نے پنڈت جواہر لال نہرو کے افکار و خیالات کا مطالعہ کیا ان کی خود نوشت سوانحعمری، تاریخ عالم اور دوسری تحریروں سے ــــ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے دل و دماغ پر مغرب کے چند گنے ہوئے نظریات مسلط ہیں۔ چونکہ خود ان کا ماضی انسان کے مستقبل اور عزائم کی تعیین میں کوئی رہبری نہیں کرتا لہٰذا وہ سمجھتے ہیں کہ جس چیز کو اپنے آپ سے مایوس ہو کر انہوں نے دوسروں سے حاصل کیا ہے اس کی صحت و عدم صحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت میں یہ ایک عجیب مشکل ہے کہ تہذیب و تمدن کی دنیا میں اگر کوئی قوم یورپ کی حریف بن سکتی ہے تو صرف مسلمان۔ اس لئے کہ مسلمان باوصف تنزل حیات انسانی کا ایک خاص تصور رکھتے ہیں اور ضروری نہیں کہ تاریخ عالم کی تعبیر اسی رنگ میں کریں جو یورپ نے اختیار کر رکھا ہے۔ یہ ایک عظیم الشان ذہنی تفاوت ہے جو ہمارے اور پنڈت جی کے درمیان پایا جاتا ہے۔ یورپ کی اس لادین اور مادیت پسند تحریک کے سرگرم مؤید ہیں جس کی انتہا اشتراکیت و اشتمالیت پر ہوئی۔ اور اس کے لئے ان کی سب سے بڑی حجت کیا ہے؟ یہی کہ مغربی اقوام نے عیسائیت کے زندگی کش اثرات کا جس طرح مقابلہ کیا ہے اس کے ایک پہلو کو ساری دنیا کی تاریخ پر منطبق کر دیا جائے۔ حالانکہ خود یورپ علی الخصوص ارض روس ہی کے پچھلے بیس سالہ حالات پر غور کر لیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ پنڈت جی کے خیالات کس قدر غلط اور حقیقت سے دور ہیں۔

اسلامی تمدن اور ملت اسلامیہ

مزید برآں پنڈت جی اس امر سے کیونکر انکار کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان ایک جداگانہ ملت اور مستقل تمدنی وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ملت کا مرکزی نقطہ دین اسلام ہے جو اس کے نزدیک انسان کے تمام احوال پر مسلط ہے خواہ وہ احوال انفرادی ہوں یا اجتماعی لہٰذا یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کی تشکیل میں جس چیز نے حصہ لیا وہ صرف اسلام ہے۔ اسلام ہی نے مختلف الوطن اور مختلف النسل انسانوں میں قومیت کا ایک مشترک احساس پیدا کیا۔ وہی ان کے مخصوص اور مستقل نصب العین، ان کے اخلاق و معاشرت اور ہیئت اجتماعیہ کا سرچشمہ تھا اور ہے۔ لیکن پنڈت جی کو اس قوم کے صاف و صریح وجود اور وحدت تمدن سے انکار ہے اور یہ محض اس لئے کہ وہ ان کے ماضی و حال کے مطالعے میں اس فرق کو

نظر انداز کر دیتے ہیں جو قوموں کے تاریخی نشو و نما اور ان کے انتہائی مقاصد کے درمیان ہمیشہ باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت میں واقعات سے تخیل کی طرف بڑھنا ایک دشوار گذار اور کٹھن منزل ہے جس کا راستہ غالباً کبھی ختم نہیں ہوگا۔ بایں ہمہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کسی ملت یا نظام تمدن کی مخصوص حیثیت کو فراموش کر دیں۔ ہم نے رسالۂ جامعہ میں پنڈت جی کے ان دو مضامین کو پڑھا ہے جن میں انہوں نے بزعم خود یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان میں نہ اسلامی تمدن کا وجود ہے نہ ملت اسلامیہ کا —— کم از کم یہ کہ سیاست و معیشت کی دنیا میں تو اس کا نام لینا بھی غلطی ہے —— اور یہ کہ ان کے سوالات کا جواب سر محمد اقبال بھی نہیں دے سکے یہ امر کہ رسالہ جامعہ نے تعمیر ملت کے نہایت ہی اہم اور ضروری فریضے سے قطع نظر کرتے ہوئے ان مضامین کی اشاعت میں کیوں حصہ لیا اور سر محمد اقبال اپنے متعدد بیانات اور تصانیف نظم و نثر کے ہوتے ہوئے بھی پنڈت جی کی تشفی میں کیوں ناکام رہے ہے بجائے خود ایک معمہ ہے لیکن جہاں تک ان مضامین کا تعلق ہے ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان میں پنڈت جی نے کسی علم و فضل یا دقت نظر کا اظہار نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں کیا ایک خاص وضع کی پھندنے دار سرخ ٹوپی اور چست پیجامہ اسلامی تمدن ہے؟ کیا اس ملک کے عامۃ الناس مسلمانوں کے لئے ایک اجنبی شہنشاہیت اور معاشی غضب نے وہی مسائل پیدا نہیں کر دیئے جن کا اس وقت ہندوؤں کو سامنا ہے؟ ہمیں تعجب ہے کہ پنڈت جی کی نظر پھندنے دار سرخ ٹوپی اور چست پیجامے سے ہٹ کر اذہان و قلوب کا رخ کیوں نہیں کرتی اور اس بات میں کونسا محال عقلی ہے کہ دو قوموں کو ایک سے مسائل پیش آجائیں۔ انہیں خود سوچنا چاہیئے کہ اصل مسئلہ انہی مسائل کا نہیں بلکہ پھندنے دار سرخ ٹوپی اور چست پیجامے کی عدم تخصیص کے باوجود سیاسی اور معاشی نصب العین اور اس کے مصدر و مبدا کا ہے۔ کیا پنڈت جی اس بیّن فرق کو نہیں دیکھ سکتے جو اس اعتبار سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں پایا جاتا ہے؟ مسائل کا اشتراک، اشتراک عمل کا مقتضی ہے، اشتراک قومیت کا نہیں۔ برعکس اس کے اگر پنڈت جی نے ہندوستان کی مختلف قومیتوں کے ماورا کوئی نئی قومیت پیدا کر لی ہے یا پیدا کرنا چاہتے ہیں تو وہ شوق سے ایسا کریں لیکن اس نئی قومیت کی تخلیق کے باوجود وہ دوسری قومیتوں کی مستقل حیثیت سے انکار نہیں کر سکتے۔

شعبۂ "اسلامیات"

یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان اپنی مستقل تمدنی حیثیت اور جداگانہ وجود پر مصر ہیں۔ لیکن پنڈت جی کے نزدیک یہ خواہش سراسر "فرقہ داری" پر مبنی ہے۔ اسلامی قومیت اور اسلامی تمدن کا نام سن کر ان کا لب و لہجہ دفعتہً سخت ہو جاتا ہے اور وہ ان کی طرف ایسے ایسے مقاصد منسوب کرتے ہیں جن کی ان کے پاس کوئی سند نہیں۔ مسلمانوں کی اس بظاہر "فرقہ دارانہ" ذہنیت

کے استیصال کے لئے پنڈت جی نے کانگریس کے اندر ایک شعبہ "اسلامیات" قائم کیا ہے جس کا آج کل بہت چرچا ہے مگر جسے صحیح معنوں میں "ادارۂ کفریات" سے تعبیر کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس شعبے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ نوجوانانِ اسلام کو جنہیں مغربی تعلیم نے پہلے ہی اپنے آپ سے بدظن کر رکھا ہے زمانہ حاضرہ کی چند دلکش اصطلاحوں اور جمہورِ اسلام کو آب و نان کا لالچ دے کر مذہب سے ورغلایا جائے تاکہ مسلمان بحیثیت ایک ملت اور مخصوص تمدنی وحدت کے اپنی مستقل حیثیت سے دست بردار کر دیں۔ اگرچہ ہمیں اس جنگ میں اسلام کی فتحمندی کا یقین ہے لیکن صرف اس ایک مثال سے کانگریس کی فرقہ دارانہ ذہنیت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ وہ ایک فرقہ دارانہ جماعت ہے اس لئے کہ اسے مسلمانوں کے لئے ایک مخصوص شعبہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اس کی فرقہ داری خالص ہندو تعصب پر مبنی ہے کیونکہ اس نے ہندوؤں کے لئے کوئی الگ شعبہ قائم نہیں کیا۔

دوستی یا دھمکی؟

افسوس ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگریس کی ہندو اکثریت سے مرعوب ہو کر ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کیا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر افتراق و انتشار پیدا کیا جائے۔ وہ یا تو کانگریس کے احکام پر بلا چون و چرا سر تسلیم خم کر دیں یا اس کے مقابلے پر طیار ہو جائیں لہذا ہم پنڈت جی سے پوچھتے ہیں کہ کیا اتحاد و اتفاق کا یہی راستہ ہے؟ اور کیا وہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے جبری اتحاد سے اقلیتوں کو یقین ہو جائیگا کہ اکثریت جو کچھ کر رہی ہے ان کے فائدے کے لئے کر رہی ہے یہاں تک کہ وہ ان کے سیاسی مفاد اور "روٹی کے مسئلے" کو بھی ان سے بہتر سمجھتی ہے

کانگریس پنڈت جی اور مسلمان

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے اس وقت پنڈت جی نے اپنے اشتراکی عقائد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کانگریس کے اصول اور لائحہ عمل اختیار کر لئے ہیں۔ لہذا جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے ہمیں ان کے ذاتی رجحانات یا ان توقعات سے کوئی بحث نہیں جو انہوں نے مستقبل سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ خود کانگریس کی اپنی سیاسی جد و جہد اور روٹی کے مسئلے کے متعلق کیا رائے ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ ہندوستان کی فاقہ مست آبادی سے ہمدردی کے باوجود کانگریس نے ہمیشہ اشتراکیت سے بریت کا اظہار کیا ہے۔ اندریں حالات ہم کانگریس سے دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ اس نے روٹی کے مسئلے میں جمہور کے لئے کیا پروگرام تجویز کیا؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے کانگریس کی روش اس بارے میں یہ ہے کہ ہم ہندوستانی اس مبارک ساعت کے منتظر رہیں جب حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آجائے۔ بہت بہتر۔ مگر یہ بھی تو ارشاد ہو کہ حصولِ اقتدار کے لئے آپ کون سے

ذرائع اختیار کریں گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کانگریس کے پاس نہ اس استفسار کا کوئی جواب ہے نہ اس کا۔ مگر دونوں صورتوں میں اس کا مشورہ یہ ہے کہ اسلامی اقلیت بلاچون وچرا اکثریت کی اطاعت پر راضی ہو جائے۔

لہٰذا ہماری مخلصانہ گذارش یہ ہے کہ پنڈت جی انڈین نیشنل کانگریس کو اکثریت کے تغلب سے آزاد کرتے ہوئے صحیح معنوں میں ایک نمائندہ جماعت کی شکل دیں۔ انہیں مسلمانوں کی انفرادی ہستی سے کوئی تعرض نہیں ہونا چاہیئے۔ ہندوستان کو اس وقت سیاسی آزادی سے لے کر روٹی کے مسئلے تک جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک دوسرے کے جائز حقوق اور غیر مشروط ترقی کا روادارانہ اعتراف ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے انہیں بہر کیف اطمینان رکھنا چاہیئے کیونکہ محکومیت اور سرمایہ داری وہ برائیاں ہیں جن سے اسلام کبھی مفاہمت نہیں کر سکتا۔

مطلا، نرم اور مضبوط جلدیں

مع فاصل کتاب

BOOK_MARKER

ضربِ کلیم اور مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق

کی (جس کے ساتھ مسافر بھی شامل ہے) خاص مطلا، نرم اور مضبوط جلدیں شائقین اقبال کیلئے خصوصیت کیساتھ تیار کرائی گئی ہیں

ضربِ کلیم مطلا اور نرم جلد قیمت تین روپے | ضربِ کلیم محض نرم جلد قیمت ڈھائی روپے

مثنوی مع مسافر مطلا اور نرم جلد

تین روپے

محصول ڈاک علاوہ

کتاب خانہ طلوع اسلام ۲۵ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

ایک اہم مسئلہ

ادارہ

مسلمانوں کا افلاس اور فلاشی اگرچہ ضرب المثل ہے لیکن فی الحقیقت ان میں سرمائے کی اتنی کمی نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ ان کی ساری مشکل یہ ہے کہ دولت کا ایک بہت بڑا حصہ اخلاقاً نااہل اور معاشی اعتبار سے غیر پیداآور (Unproductive) ہاتھوں میں ضائع ہو جاتا ہے۔ تجارتی اور صنعتی اقدامات سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں جدید معاشی زندگی اور اس کے مقتضیات سے وہ تقریباً ناواقف ہیں۔ لہٰذا عام مسلمانوں کی مالی حالت دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ گر چکی ہے ـــــ اندریں حالات کیا ہمارا فرض نہیں کہ ذی استطاعت حضرات کو اس امر کی طرف متوجہ کریں کہ انہیں ہندوستان کی اقتصادی اور کاروباری دنیا میں مضبوطی کے ساتھ قدم جمانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا ہونے سے ہماری قوم اور بالخصوص جمہور اسلام کے بہت سے مسائل حل طلب رہ جائیں گے لیکن سردست ہمارا تعلق اس مسئلے کے صرف ایک پہلو سے ہے اور وہ بھی نہایت محدود شکل میں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس وقت ہمارے سیاسی ماحول اور اجتماعی Social نظام میں کسی بنیادی تغیر کی ضرورت ہے تاہم ہم اپنے مالی استحکام اور افزائش دولت کے لئے بہت سے ذرائع اختیار کر سکتے ہیں اور یہ بالکل ممکن ہے کہ من حیث القوم ہماری معاشی حیثیت اس قدر پست نہ رہے جیسی کہ اب ہے۔ مثال کے طور پر اس ملک کی دوسری قوموں کو لیجئے ان کے راستے میں بھی وہی سیاسی اور معاشی رکاوٹیں حائل ہیں جو ایک اجنبی شہنشاہیت کی وجہ سے مسلمانوں کو پیش آئیں۔ مگر اس کے باوجود ان کے پاس دولت بھی ہے اور طاقت بھی اور کسی نہ کسی رنگ میں اکتساب و تجارت کے تمام ذرائع پر انہیں کا تصرف قائم ہے۔

لہٰذا ہمارے افلاس اور معاشی پستی کا ایک بہت بڑا سبب ـــــ جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا تھا ـــــ دولت کا وہ مسلسل اور مستقل اسراف یا عدم استعمال ہے جو نہایت آسانی کے ساتھ ایک قیمتی اور زبردست سرمائے کی شکل میں منتقل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی ضرورت اس امر کی ہے کہ جو سرمایہ بے کار پڑا ہے حرکت میں آئے

اور ہمارا دولت مند طبقہ جس نے یا تو ابا و اجداد بڑی بڑی جائیدادیں حاصل کی ہیں یا فی زمانہ اپنی محنت اور بہت سے روپیہ کمایا ہے انفرادیت پسندی کو چھوڑ کر اپنی ساکھ اور اعتماد پیدا کرے تاکہ ان کی مجتمعہ کوششیں بڑے بڑے کاروباری اقدامات کی شکل اختیار کر سکیں۔ اس طرح ان کی ذاتی آمدنی ہی میں اضافہ نہیں ہوگا بلکہ اگر انہوں نے زمانے کی مقتضیات کو سمجھا اور شریعت اسلامیہ کا احترام قائم رکھا تو ان کا وجود ملت کے لئے بہت بڑی سعادت اور برکت کا موجب بن سکتا ہے۔ غیر استعمال شدہ سرمائے کو حرکت میں لانے کے ساتھ ساتھ ہماری دوسری ضرورت یہ ہے کہ جو سرمایہ کسی غلط شکل میں ضائع ہو رہا ہے اس کو روکنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے اپنے اوقاف اور مساجد و مدارس جن میں نئی اور پرانی درسگاہیں شامل ہیں ——— پر توجہ کرنا پڑیگی۔ ہماری حیاتِ ملی کے یہ عظیم الشان ادارے جن پر نوجوانانِ اسلام کی مالی امداد اور اخلاقی، دینی اور ذہنی تربیت کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ بجائے خود کس مپرسی کے عالم میں ہیں جس کے بہت سے وجوہ ہیں مثلاً ذاتیات، رقابت، نالائقی، بدانتظامی مگر ان میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری قوم کے پیشِ نظر نہ اپنے وجود ملی کا تصور ہے نہ کوئی نصب العین۔ لہٰذا ان اداروں میں روپیہ ضائع ہوتا ہے اور خوب ہوتا ہے اور کوئی نہیں پوچھتا کہ مسلمان ایسی عاجز اور درماندہ مخلوق اس اسراف اور فضول خرچی کو کہاں تک برداشت کر سکتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر زکوٰۃ و صدقات کا بے جا صرف اور بے جا استعمال ہے جو ہر سال لاکھوں کی تعداد میں پیشہ ور اور کوچہ گرد ملاؤں کی جھولیوں میں تقسیم ہو کر ضائع ہو جاتا ہے۔ قومی اور بالخصوص مذہبی چندوں کا زبردست بوجھ ان کے علاوہ ہے۔ ہمارے "دینی" پیشواؤں کی یہ عام روش ہے کہ اول وہ اپنی ابلہ فریب باتوں سے نادار مگر خدا ترس مسلمانوں کو انفاق فی سبیل اللہ، پر آمادہ کرتے ہیں اور پھر خدمتِ اسلام کا سبز باغ دکھا کر ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے ہیں۔ حالانکہ مذہب کے ان خود ساختہ اجارہ داروں کو شریعتِ اسلامیہ کے احیا و تحفظ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ کبھی کبھی وہ مالی استحکام اور معاشی اصلاح کی "تجاویز" بھی پیش کر دیتے ہیں ——— محض زمانے کے اثر سے مجبور ہو کر ——— مگر ہر حال میں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دولت کا بہاؤ کسی دوسری طرف نہ ہٹنے پائے۔ یہ لوگ ملت کی ضروریات سے کس قدر بے خبر ہیں اور اسلام اور انسانیت سے کس قدر دور اس کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جہاں ان کے ذاتی مال و دولت اور آرام و تعیش میں اضافہ ہو رہا ہے وہاں قوم کا سیاسی، اخلاقی اور معاشی انحطاط دن بدن ترقی پر ہے۔ یہ ہے ان کی خدمتِ اسلام اور دینداری کا خوفناک نتیجہ!

یہ صورت حالات کچھ کم تاسف خیز نہیں تھی۔ بدقسمتی سے دو اور مفاسد ہیں جن سے ایک طرف ہمارے افلاس و مسکینی اور دوسری جانب انتشار اور بے ربطی میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارا مطلب ہے نو تعلیمیافتہ یعنی متفرنج اور "علماء" کی تنگ نظر اور تاریک خیال جماعت سے جنہوں نے چکی کے دو پاٹوں کی طرح عامۃ المسلمین کو پیس دیا ہے انمیں سے ایک سراپا حرکت ہے دوسری سراپا جمود۔ ایک کے اندر اضطراب ہے بے قراری ہے۔ دوسری خاموش اور بے حس۔ ایک کہتی ہے کہ مفتی افرنگ کے ہر فتوے پر خواہ اس سے تمہارے وجود کی نفی ہو جائے بلا چون وچرا سر تسلیم خم کردو دوسری کا یہ حال ہے کہ اس کے بے فکر دماغ میں خیالات کی جو مختصر سی دنیا قائم ہے اس کے ماورا اسے کوئی حقیقت ہی نہیں آتی۔ گویا دو مخالف اور متضاد قوتیں ہیں جو مسلمانوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں بلکہ صحیح معنوں میں یہ کہنا چاہئے کہ یہ لڑائی ہے جمود اور حرکت کی جس میں بظاہر حرکت کا غلبہ یقینی نظر آتا ہے کیونکہ پیٹ ایک بہت بڑا فتنہ ہے اور ایمان کی دولت نہایت کمیاب۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہماری جماعت کا ایک طبقہ ظاہراً خاموشی مگر درپردہ پوری بے اعتنائی کے ساتھ کسب معاش کی دنیا میں وہ ذرائع اختیار کر چکا ہے جو شریعت میں قطعاً ممنوع ہیں؟ لیکن اب مقابلہ ان لوگوں سے ہے جنکی زبانوں پر اعتراضات ہیں، شور و غوغا ہے اور جن کے لب و لہجہ میں ادعا و تحکم پایا جاتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہمارا راستہ غلط سہی مگر راستہ تو ہے۔ تم الحاد و بے دینی اور طعن و تشنیع کے سوا کچھ کرتے بھی ہو؟ کچھ نہیں!

اگر غور سے دیکھا جائے تو ہمارے اجزائے ملت کا یہ انتشار اور تضاد سراسر غلط اور بے معنی ہے۔ اس لئے کہ اسلام جو فی الحقیقت عبارت ہے ایک اصولِ حیات سے اپنا ایک معاشی نظام بھی رکھتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نظام۔ دنیا کے ہر نظام کی طرح ——— انسان کی معاشی سرگرمیوں کو (بعض چیزوں کی حلت و حرمت کے متعلق ضروری ہدایات کے علاوہ) ایک خاص نہج پر ڈالتے ہوئے اس کی تفصیلات و جزئیات اور فنی پہلوؤں کو خود اس کے فہم و بصیرت پر چھوڑ دیتا ہے جس سے ایک طرح ہمارے "فرقہ معاشی" کی ابتدا ہوتی ہے۔ بایں ہمہ اس امر سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ اس کی عملی ترجمانی کا جو سلسلہ حضور رسالتمآب صلعم کے زمانۂ مبارک سے شروع ہوا تھا اور جسے اسلام کے سیاسی اور ذہنی نشو و نما کی بدولت غیر معمولی وسعت حاصل ہوئی وہ آگے چل کر ہمارے اختلافات، کم نظری اور انحطاط و تنزل کے باوجود اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ مغربی استعمار اور شہنشاہیت کے سیلاب نے اسلامی ریاستوں کا بالکل خاتمہ نہیں کر دیا۔ الا یہ کہ اس کے جزئیات کہیں کہیں باقی ہیں۔ مگر ایک بات ظاہر ہے اور وہ یہ کہ اسلامی نظام معیشت اور

مغرب کا نظامِ سرمایہ داری جو گویا قدیم نظامِ سرمایہ داری ——— جس کے خلاف اسلام نے جنگ کی ——— ایک نہایت درجہ ترقی پذیر اور پیچیدہ شکل ہے۔ اصولاً اور ذہناً ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ناممکن ہے کہ ان کے درمیان کوئی مفاہمت ہو سکے۔ حال ہی میں اس نظام کے خلاف ایک ردِ عمل ہوا ہے جسے اشتراکیت و اشتمالیت سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو ایک لحاظ سے ایک جدید معاشی نظریہ ہے اور ایک لحاظ سے یورپ کی تاریخ کا ایک مخصوص مظہر اور اس کی لادین اور مادیت پسند ذہنیت کی انتہائی شکل۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ وہ ایک عظیم الشان معاشی تجربہ Experiment اور نظریہ Theory ہے جس پر ہمیں نہایت سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے کیونکہ ایک تو وہ موجودہ نظامِ سرمایہ داری اور اس کے عالمگیر مفاسد کے خلاف جن کا نتیجہ افلاس بھی ہے اور محکومیت بھی ایک زبردست اور مؤثر احتجاج ہے اور دوسرے اس کی روح اور اس کا مطمحِ نظر بہت سی باتوں میں اسلام کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا ہمارے اربابِ سیاست و معیشت اور علماء و فقہا کا فرض ہے کہ اول الذکر اپنی معلومات، مطالعہ اور وسعتِ نظر اور موخر الذکر اپنی قوتِ اجتہاد اور فراستِ دینی کی بدولت مسلمانانِ ہند کے لئے معاشی اعتبار سے ایک ایسا لائحہ عمل تجویز کریں جو ہماری حیاتِ ملی کے استقلال اور نشوونما کے ساتھ ساتھ وسعت و ارتقا حاصل کرے اور جس میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ جدید تجربات سے فائدہ اٹھانے کے باوجود اس کا دامن شریعتِ اسلامیہ سے وابستہ رہے۔ یہ صحیح شکل ہوگی اسلام کے نظامِ معیشت کے احیا و تجدید اور اس اجتماعی تحریک کو Social movement از سرِ نو عمل میں لانے کی جس کی ابتدا اسلام سے ہوئی۔ ہمارے لئے اشتراکیت یا کسی مخصوص معاشی نظام کے رد و قبول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے مستقبل کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں دنیا کے ہر نظام اور ہر تجربے کی طرف آزادانہ قدم بڑھائیں۔

لہٰذا اگر اس ملک میں ——— جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ——— اسلامی نظامِ معیشت کی تاسیس صرف اس طرح ممکن ہے کہ ہم اپنی 'سیاستِ معاشی' کا ایک صحیح اور واضح تصور قائم کرتے ہوئے اس کے لئے عملاً جد و جہد کریں وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے گرد و پیش کی تجارتی اور کاروباری دنیا کا جائزہ لیں اور قوم کی مالی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ ہمارے افلاس اور بے روزگاری کا ایک سبب غلامی اور محکومیت ہے دوسرا اس ملک کی ہندو اکثریت کا سرمایہ دارانہ تغلب اور صاحبِ حیثیت مسلمانوں کی غفلت۔ اول الذکر کا تعلق ہماری سیاسی جد و جہد سے ہے

جس میں ہمیں اپنے معاشی نصب العین کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ موخرالذکر کا علاج یہ ہے کہ مسلمانوں کے غیر پیدا آور سرمائے کو حرکت میں لانے کی کوشش کی جائے تاکہ ان کے اندر تجارت اور صنعت و حرفت کا شوق پیدا ہو اور وہ ایک حد تک اپنے افلاس و بے روزگاری کو دور کر سکیں۔ اس وقت ہندوستان کا سارا کاروبار اور ذرائع آمد مثلاً بنک، بیمہ کمپنیاں وغیرہ تقریباً غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہیں۔ مسلمان مالی اعتبار سے مقروض ہیں اور معاشی لحاظ سے دستکار جو اپنے خون اور پسینے سے دوسروں کے لئے آرام و آسائش کے اسباب مہیا کرتے ہیں متوسط الحال شہری طبقوں اور اہلِ ثروت کا روپیہ زکوٰۃ و صدقات اور چندوں کی شکل میں ضائع ہو جاتا ہے یا اس سے دوسری قومیں فائدہ اٹھاتی ہیں۔ مسلمانوں کی افسوسناک مالی حالت کا یہی پہلو ہے جس کی طرف ہم نے ابتدا ہی میں اشارا کیا تھا اور جسکی اصلاح کا عمل ہماری سیاسی اور معاشی جد و جہد کے ساتھ ساتھ جاری رہنا چاہئے۔ کیونکہ مستقبل میں صرف وہی تحریک کامیاب ہو سکتی ہے جو حال کو نظر انداز نہ کرے۔

اس سلسلے میں ہمارا پہلا قدم تو وہی ہوگا جس کا تعلق ہماری سیاست معاشی سے ہے۔ یعنی مسلمانانِ ہند کے اس نصب العین سے کہ وہ اپنے قوانین و شرائع ——— صرف ذاتی قانون Personal - Law نہیں بلکہ اسلام کا مکمل نظامِ جماعت ——— کے نفاذ اور حصولِ مرکزیت کے لئے ایک اسلامی ریاست کا تخیل پیدا کریں۔ یہ صرف شریعت اور اس کا تدریجی نشو و نما ہے جو خود مسلمانوں کو سرمایہ داری اور اس کی خرابیوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ بغیر اس کے نہ آپ زکوٰۃ و صدقات کے ناجائز مصرف کو روک سکتے ہیں، نہ اوقاف اور مساجد و مدارس کی اصلاح ممکن ہے، نہ یہ ہو سکتا ہے کہ مذہب اور سیاست کے نام پر قوم سے چندوں کی شکل میں جو ٹیکس وصول کیا جاتا ہے غاصبوں کے ہاتھ سے بچ سکے جو گویا غریب مسلمانوں کا خون چوس رہے ہیں۔ ہندوستان میں کئی ایک دفعہ یہ آواز بلند ہوئی کہ ہمیں امامت کی ضرورت ہے، بیت المال کی احتیاج ہے، زکوٰۃ و صدقات کی تنظیم اور جائز مصرف کی صورت کیا ہے، اوقاف و مساجد کی اصلاح کیسے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ اصولاً یہ تمام آوازیں ٹھیک تھیں مگر اس لئے ناکام رہیں کہ ان کی کامیابی کے لئے، جو سیاسی اور معاشی قالب ناگزیر ہے اس کا یا تو ہم نے تصور ہی نہیں کیا اور اگر کیا تو اس ڈر سے کہ وہ عہدِ جدید کے عمرانی تصورات سے مختلف ہے خاموش ہو گئے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو موجودہ زمانے کے عمرانی رجحانات خود اسلام کی طرف مائل ہیں اور ہندوستان کے اتحاد یا آزادی میں اس امر سے کیا فرق آسکتا ہے

کہ مسلمان اپنی ملی زندگی کے ارتقا کے لئے سیاسی اور معاشی دونوں لحاظ سے ایک الگ راستہ اختیار کریں ـــــ الگ اس لئے کہ خود اسلام کو اسے الگ رکھنا منظور ہے ـــــ افسوس ہے یہاں ان دلائل کی بحث کا موقعہ نہیں جو اس مقصد کے خلاف دوست اور دشمن دونوں کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ جو اصولِ حیات میری ذات، میرے وجود اور میرے انفرادی احساسات و کیفیات سے لے کر میرے اجتماعی شعور کے ہر پہلو اور ہر شکل کو متعین کرتا ہے اسے آپ چند خود ساختہ مصالح اور سیاسی مجبوریوں کے عذر میں پس پشت ڈالتے ہیں اور اس کے باوجود یہ توقع رکھتے ہیں کہ میری حیات ملی کا تسلسل باقی رہیگا؟ نفسیاتی اعتبار سے یہ اتنی بڑی غلطی ہے کہ اس طرزِ عمل کی حمایت کرنا گویا اسلام اور مسلمان دونوں کی نفی کرنا ہے۔

ثانیاً علمائے امت کا فرض ہے کہ وہ اپنی قوت اجتہاد سے کام لیتے ہوئے اس وقت کی معاشی زندگی کا بغور جائزہ لیں۔ مسلمان از روئے شریعت اس وقت تجارت اور کاروبار کی بہت سی شکلوں کو ناجائز سمجھتے ہیں بیع شرکی کے عام اور ناقابل اعتراض سلسلے کو چھوڑ کر ـــــ بشرطیکہ اس پر بنیادی اعتبار سے کوئی بحث نہ کی جائے ـــــ اس امر کا فیصلہ ضروری ہے کہ ہمارے لئے کون سی چیز جائز ہے اور کون سی ناجائز۔ فقہ اسلامی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض چیزیں اضطراراً جائز ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہو جانا چاہئے کہ اضطرار کی حد کہاں شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم۔ یہاں اس امر کی بحث فضول ہے کہ آیا باب اجتہاد مسدود ہے یا مفتوح۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو جہاں تک ہماری عملی اور فوری ضروریات کا تعلق ہے عوام سے لے کر پڑھے لکھے اور دیندار مسلمانوں تک اجتہاد کا ایک انفرادی اور بے قاعدہ سلسلہ خود بخود جاری ہے کیا یہ صحیح نہیں کہ تجارت اور کاروبار کی بہت سی شکلیں جو مسلمانوں کے لئے شرعاً ممنوع ہیں مثلاً سودی لین دین، سٹہ یا مسکرات فروشی بعض لوگوں نے آپ ہی اپنے لئے حلال کر لی ہیں۔ کیا مسلمانوں میں یہ مسئلہ بار بار نہیں چھیڑا گیا کہ بنکوں کا سود اور زندگی کا بیمہ جائز ہے یا نہیں؟ اور پھر کیا بہت سے مسلمانوں نے از خود اس کی حلت و حرمت کا فیصلہ نہیں کر لیا۔ یہ بحثیں تو خیر بہت اہم ہیں کیا ہمارے روزمرہ لین دین، خرید و فروخت اور قرض اور رہن کے معاملات شرعی اعتبار سے قابل اعتراض نہیں؟ اگر یہ صحیح ہے تو اس قوم کے اجتماعی انحطاط کے متعلق کیا رائے ہے جس کے نزدیک چند خیالی اور فرعی مسائل میں تو اجتہاد کے جواز و عدم جواز کے متعلق گفتگو کا امکان ہے۔ مگر جس نے زندگی کی فوری اور بنیادی ضروریات کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ طے کر لیا ہے کہ ان امور پر گویا اسلام کی

روشنی میں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور اس طرح ملت کے سوادِ اعظم کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ کفار و طغیان کا راستہ اختیار کرے۔ کبھی کبھی چند لوگ ملتے ہیں اور بعض سیاسی اور معاشی مسائل کے متعلق حسب مطلب فتویٰ حاصل کر لیتے ہیں جس سے علما کی عزت و بزرگی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور اسلام کے جسدِ اجتماعی میں نئے نئے عوارض اور فتنوں کا دروازہ کھلتا ہے فقہی اعتبار سے اس وقت مسلمانوں کو حتماً معلوم ہونا چاہیئے کہ اصولِ شریعت کی روشنی میں حلت و حرمت کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے اور اگر کوئی امر اضطراراً جائز ہے تو کب اور کس طرح ورنہ محض اضطرار کا عذر پیش کرنا ناجائز کو جائز قرار دینے کا ایک حیلہ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے موجودہ حالات میں کسی قسم کی تبدیلی کے خواہشمند نہیں۔ لہٰذا اگر ہم اس امر کی تحریک کریں کہ مسلمانوں کا سرمایہ غیر پیدا آور ہاتھوں میں ضائع ہونے کی بجائے کسی مفید تجارت یا کاروبار میں صرف ہو تو اول ان تمام امور پر غور کر لینا ضروری ہوگا جن کو ہم نے ابھی عرض کیا ہے۔ مثال کے طور پر بنک اور بیمہ کمپنیوں کو لے لیجئے۔ موجودہ زمانے میں یہ دونوں کاروبار کسی قوم کے مالی استحکام کا سب سے زیادہ کامیاب اور موثر ذریعہ ہیں اور اگرچہ ان کی ابتدا نظامِ سرمایہ داری کی وجہ سے ہوئی جن کو معلوم نہیں ہمارا نظامِ معیشت کلیتہً رد یا کس قدر ترمیم کے ساتھ قبول کرے مگر فی زمانہ مسلمان مجبور ہو گئے ہیں کہ بنک اور بیمہ زندگی سے فائدہ اٹھائیں۔ اول الذکر سے سرمائے کی حفاظت کے علاوہ تھوڑا بہت سود حاصل ہوتا رہتا ہے اور موخر الذکر حفظ ماتقدم کے علاوہ معمولی پس اندازی سے ایک اچھا خاصا سرمایہ جمع کرنے کا نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔ لیکن چونکہ یہ دونوں کاروبار غیر مسلم سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہیں اس لئے ہر سال لاکھوں روپے ہمارے ہاتھ سے نکلکر دوسروں کے لئے مالی تقویت اور حصولِ معاش کا باعث ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس وقت تک صرف ایک بیمہ کمپنی ہے یعنی مسلم انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور جو خالص اسلامی سرمائے سے قائم ہوئی ہے اور جس کی مجلسِ امنا Directorate حسن انتظام اور رفتارِ ترقی کو دیکھتے ہوئے بوثوق کہا جا سکتا ہے کہ بہت تھوڑے دنوں میں اس کا شمار ہندوستان کی ممتاز ترین کمپنیوں میں ہونے لگے گا۔ اب اگر مسلمان یہ طے کر لیں کہ اضطراراً ـــــ اگر مستقل طور پر نہیں ـــــ بیمے کا کام جائز ہے تو ممکن ہے اور اسلامی کمپنیاں میدان میں آجائیں۔ جس سے مسلمانوں کے لئے من حیث القوم دولت اور فارغ البالی کے علاوہ اور بھی مفید نتائج مترتب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً نوجوانوں کے لئے معاش اور قوم کے لئے مالی امداد کا ایک مستقل ذریعہ ـــــ مسلم انشورنس کمپنی کا ارادہ ایک "بیت المال" قائم کرنے کا ہے ـــــ یہی کیفیت بنک اور مشترکہ سرمائے کی دوسری تجارتوں کی ہے۔ ہماری

سیاسی اور معاشی جدوجہد کے ساتھ تطابق پیدا کرتے ہوئے ہمارے پیش نظر مقاصد میں رکاوٹ کی بجائے مزید آسانی کا موجب ہو سکتے ہیں کیونکہ اس طرح (۱) اسلامی سرمایہ حرکت میں آئیگا اور مسلمانوں کی دولت کا ایک بہت بڑا حصہ دوسری قوموں کے ہاتھ مضبوط کرنے کی بجائے ہمارے مالی استحکام کا باعث ہوگا۔ (۲) مسلمان اس ملک کی تجارت اور صنعت و حرفت میں آگے بڑھنے کے ساتھ دلی جوش اور ایثار سے کام لیں گے کیونکہ ان کا اپنے کاروبار کو ترقی دینا گویا اکثریت کے تغلب سے آزادی حاصل کرنا ہے اور (۳) چونکہ وہ جو کچھ کریں گے **اسلامی شریعت** کے مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے کریں گے لہٰذا ان کے اضطراری اقدامات بھی رفتہ رفتہ ان کے معاشی نظام میں ضم ہو جائیں گے۔ برعکس اس کے اگر ہم نے اپنی قوم کے بنیادی مسائل سے غفلت اور بے اعتنائی برتی اور افراد و اقوام کی اس کشاکش سے بے خبر رہے جو زندگی اور اس کی مقتضیات کے متعلق ایک نہایت وسیع پیمانے پر تمام دنیا میں جاری ہے تو ہمارے انتشار اور بے ربطی میں دن بدن اضافہ ہوتا جائیگا اور پھر شاید یہ ممکن نہ ہو کہ ہم اپنی ملت کے پراگندہ اجزا میں از سر نو ربط و اتحاد پیدا کر سکیں

بے نظیر

قادیانی مذہب

ضخامت بارہ سو صفحات

تصنیف پروفیسر محمد الیاس برنی ایم۔ اے

بانی احمدیت، تحریک احمدیت، اسکے عجیب و غریب اختلافات اور اجتہادات کا صحیح آئینہ دیکھنا ہو تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے جس میں خود بانی احمدیت اور پیروان احمدیت ہی کی تحریروں سے اس فتنے کا سدباب کیا گیا ہے۔

قیمت غیر مجلد تین روپے — مجلد چار روپے علاوہ محصول ڈاک

شناخت مجدّد

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا مشہور رسالہ اس امر کی بحث میں کہ آیا بانی احمدیت اس منصب کے اہل ہیں یا نہیں۔ جماعت احمدیہ سے آج تک اس کا جواب بن نہیں پڑا۔ قیمت آٹھ آنے

کتاب خانہ طلوع اسلام ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور

رجال و مشاہیر

دو مصری شاعر

سید نصیر احمد بی۔ اے

یہ مضمون جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن سے ماخوذ ہے ——— نصیر احمد

۱۔ شاعر نیل ——— حافظ ابراہیم

۴ فروری ۱۸۷۲ء کو حافظ ابراہیم قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک نادار اور کم حیثیت باپ کے بیٹے تھے جس نے تنگیٔ معاش کے باوجود ان کی تعلیم کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے بعد حافظ ابراہیم "ادارہ حربیہ" میں داخل ہوئے اور لفٹننٹ دوم کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ان کی فوجی ملازمت کا سارا زمانہ سوڈان میں گذرا ——— اور وہ بھی لارڈ کچنر کی ماتحتی میں۔ یہیں انہوں نے اپنی مشہور نظموں کا آغاز کیا، وہ نظمیں جنمیں وطن کی حسرت آمیز یاد اور احباب سے ملنے کے لئے بے قراری کا اظہار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے نوجوان ابراہیم کا دل مصر اور اہلِ مصر کی محبت سے لبریز تھا جس نے رفتہ رفتہ ایک بھڑکتے ہوئے شعلے کی صورت اختیار کر لی۔

قاہرہ میں وہ اپنے دوستوں کو لکھتے ہیں:۔

"اس کی طرف سے جس کی تھکی ہوئی آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی ہے۔ قسمت کا مارا اور بدنصیبی کا ستایا ہوا۔ جسے ہمیشہ کے لئے احباب کی شیریں گفتگو سے دور پھینک دیا گیا ہے۔

اس کا ناکام دل تمہارے لئے آزردہ ہے

اے میرے سچے دوستو! بادہ و ساغر کے ساتھیو

جنہوں نے اس بات کا حلف اٹھایا تھا کہ وہ چین سے نہیں بیٹھینگے۔

جب تک اس سرزمین میں ایک بھی مظلوم باقی ہے

میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں گلاب کے پھول سے زیادہ خوبصورت اور اس صحت سے زیادہ گرم جس کا تعلق مضبوط

جسم سے ہے محبت کی مبارک باد ——— ہمیشہ قائم رہنے والی
وہ محبت جسے الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے۔
کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میری قسمت
مجھے تمہارے پاس لے آئے گی یا ہمیشہ ہمیشہ مجھے ان کوہستانی سلسلوں میں پھینک دے گی۔
جو خون آشام شیروں کا مسکن ہے
اور تیز آواز گیدڑوں کا
اگر میرا آخری وقت یہیں آپہنچا ——— اور موت سے فرار ناممکن ہے
تو میں خدا کے نام پر تم سے التجا کرتا ہوں کہ
جب بزمِ احباب گرم ہو اور نازک اندام ساقی جام پر جام لنڈھا رہا ہو۔
جب بدر کامل کا نور ہر طرف پھیلا ہو تو تم اسے یاد رکھنا جس نے یہ اشعار لکھے ہیں۔

۱۸۹۹ء میں حافظ ابراہیم کا تبادلہ "اخیاطیوں" میں ہو گیا اور پھر ان کی خدمات پولیس میں منتقل ہو گئیں لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد ان کا زمانہ ملازمت ——— جس کی کل مدت ۱۴ سال ہے ——— ختم ہو گئی اور وہ قاہرہ واپس آ گئے۔ اب موقعہ تھا کہ وہ اپنے شاعرانہ کمالات سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ اول اول انہوں نے دربارِ خدیوی اور امرا کی طرف توجہ کی لیکن انہوں نے اپنے زمانے کا نہایت غلط اندازہ کیا۔ اسلئے کہ اسوقت دربار ایک نوجوان شاعر کے زیر اثر تھا جو یورپ سے ہو آیا تھا اور فرانسیسی بولتا تھا۔ ہمارا مطلب ہے احمد شوقی بے (آگے چلکر ملک الشعرا) سے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک فوجی شاعر کو خواہ اس کی زبان میں کتنا ہی ترنم ہوتا شوقی پر ترجیح دی جاتی۔ امرا نے ان کی سرپرستی سے انکار لیکن ابھی ایک سرپرست باقی تھا' ایک صدی اور اکھڑ سرپرست جو شاعر کو پسند آگیا جسکے لئے اس نے اپنا دل و جان سب کچھ پیش کر دیا ——— گویا اب حافظ ابراہیم جمہور کے شاعر تھے۔

مصر کے مشہور صحافی اور ادیب محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں۔ "حافظ کی شاعری مصر کا آئینہ ہے۔ اور ڈاکٹر طہٰ حسین کی رائے ہے کہ "حافظ ابراہیم کے دو نمایاں وصف ہیں۔ اولاً یہ کہ وہ ایک شریف النسان تھے اور غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے اور ثانیاً ان کے اور جمہور کے دل میں ایک خاص تعلق تھا۔ دونوں کے مقاصد ایک

تھے تمنائیں اور آرزوئیں ایک — وہ ایک فرد تھے مگر تمام مصر تمام مشرق بلکہ ساری انسانیت ان کے دل میں بستی تھی۔" انہوں نے اپنے سرپرست کی نہایت مخلصانہ خدمت کی۔ اس سرپرست کے لئے خوشامد اور چاپلوسی کی بجائے التجا اور منت وسماجت کی ضرورت تھی۔ کبھی اس سے درخواستوں سے کام لینا پڑتا تھا کبھی ڈانٹ اور سختی سے، شاعر کا بہرکیف فرض تھا کہ اس کی پیروی کو چھوڑ کر اس کی رہنمائی اختیار کرے۔ اس طرح حافظ ابراہیم بہت جلد ان محبِ وطن نوجوانوں کے علمبردار بن گئے جو غیر ملکی حکومت کے پنجے سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ان سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"اے نیل! نیند کا وقت گذر چکا

مصر سو رہا ہے مگر مصر کے ساحلوں سے ایک نئی بیداری ہویدا ہے۔ نشے سے تھکے ہوئے دماغوں نے بہت کافی عرصے تک اسے بے جان رکھا۔ لیکن جب خدا کسی قوم کو زندگی دیتا ہے تو پھر اسے نہ طاقت فنا کر سکتی ہے نہ استبداد۔

صبح کا انتظار کرنے والو! تمہارا وطن تم سے درخواست کرتا ہے انسانوں کی طرح ہمت سے کام لو، مضبوط بن جاؤ، اپنے گھروں کی حفاظت کرو، آزاد ہو جاؤ۔

اگر تمہیں دستور کی تلاش ہے تو ان تکلیفوں پر افسوس مت کرو جو تمہیں پہنچی ہیں۔

اس شخص نے اپنا حق کبھی حاصل نہیں کیا جس کی تلوار میان میں ہے۔ اور اس کا حق کبھی نہیں چھنتا جسے جنگ کی پرواہ نہیں۔"

لیکن جب حافظ نے دیکھا کہ ان اشعار سے وہ قیامت بپا نہیں ہوتی جس کا وہ آرزومند ہے تو وہ مصر کو اسلام کی گذری ہوئی عظمت اور شان و شوکت کی یاد دلاتا ہے۔ اب اس کا خطاب نئی پود سے ہے۔ وہ پود جو ابھی مدرسوں میں بادشاہوں اور بہادروں کی کہانیاں پڑھتی ہے:۔

"ہمیں ہماری شہرت اور تقویٰ واپس دے دو اور مسلمانوں کی قابلِ فخر وراثت کی حفاظت کرو

جو خدا اور صرف خدا کے سامنے جھکتے ہیں

ہمارے بزرگ جنگجو تھے، بہادر تھے

ہم نے مدت تک دنیا پر حکومت کی
اس پر شکوہ نام کو بلند رکھو جو ہمیشہ باقی رہیگا!

عمرؓ آئے اور کسریٰ کی سلطنت کا خاتمہ ہوا وہ زمانہ عدل و انصاف کا زریں دور تھا!
آسمان بھی خراج ادا کرتا تھا جب ہارون الرشید شہنشاہ بنا۔
کیسی کیسی نعمتیں لوگوں کو میسر تھیں
ہر جگہ نیکی کی قدر ہوتی تھی
ہمارا قول ہی یہ تھا "امن اور رحم"

بغداد سے پوچھو۔ اس کا کوئی حریف تھا
جب بغداد کا مذہب محض اسلام تھا

اس وقت تقویٰ اس لئے نہیں تھا کہ انسان کمزور ہو جائے اس وقت ہر طرف علم حکمران تھا۔

ملازمت سے الگ ہونے کے بعد حافظ ابراہیم کی گذر اوقات مشکل سے ہونے لگی۔ شاعری ذریعہ آمدنی تھا نہیں اور پنشن اتنی ملتی نہیں تھی کہ ان کے لئے کافی ہوتی۔ ۱۹۱۱ء میں چند با اثر احباب نے انہیں مصری کتب خانے میں ایک مستقل جگہ دلوادی۔ ۱۹۳۲ء تک ان کا یہ مشغلہ قائم رہا۔ یورپ اور بالخصوص فرانس میں یہ قاعدہ ہے کہ اچھے اچھے شعراء اور ادیبوں کو کسی متحف یا کتب خانے میں جگہ دے دی جاتی ہے تاکہ معاش کی فکر سے آزاد ہو کر وہ اپنی علمی اور فنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ یہ جگہ حافظ ابراہیم کو اسی غرض سے لوائی گئی تھی مگر وہ شاہ خرچ آدمی تھے۔ انہوں نے اپنا سارا وقت اور روپیہ دوستوں کی خاطر مدارات اور سیر و تفریح میں صرف کر دیا۔

حافظ کی شاعری کا سب سے موثر پہلو ان کی حب الوطنی کا جذبہ ہے۔ جدید ادب عربی میں اس کی ابتدا انہیں سے ہوئی اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ ان کی یہی شاعرانہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا۔ انہوں نے جاپان کی فتح پر ایک نظم لکھی جسمیں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مشرق کا تسلط بہت جلد مغرب پر قائم ہو جائیگا۔ وہ کہتے ہیں اہل مصر

کو جاپان سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ سیاسی حوادث مثلاً سمرنا کا جلنا اور یونان کی شکست ترکوں سے وغیرہ پر انہوں نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ برطانیہ پر بھی اظہارِ غیظ و غضب کیا ہے۔ مختصر یہ کہ جب کبھی مورخ نے مصر کی تحریک آزادی پر قلم اٹھایا تو وہ حافظ ابراہیم اور ان کی شاعری کو جس نے مصریوں میں محبت وطن کی روح پھونکی فراموش نہیں کر سکیگا۔

مرثیہ نگاری پر انہیں کمال حاصل تھا۔ سعد زاغلول پاشا مرحوم زعیم مصر کی وفات پر انہوں نے جو نظم لکھی اس کے ایک حصے میں کہتے ہیں:۔

"اے دوست کیا تو نے دیکھا؟
کس سانحے نے ایک طوفان کی مانند ہمارے دلوں میں طغیانی پیدا کر دی
ابھی صبح نہیں ہوئی تھی جب مشرق سے مغرب تک یہ خبر پھیل گئی
ہمارا سردار اب ہم میں نہیں!
ستاروں سے کہہ دو۔ سعد کا چمکتا ہوا دن ختم ہو گیا۔
آسمان کے ستاروں نے غم کی ردا اوڑھ لی
روشنِ دوپہر پر تاریکی نے قبضہ کر لیا
اور رات اس پردے میں چھپ گئی جہاں آفتاب غائب ہو گیا تھا۔

اے آفتاب رات سے کہہ دے۔ ستارۂ ارضی غروب ہو گیا، زمین سے غائب ہو گیا
اس لئے میں بھی آسمان سے رخصت ہوتا ہوں،
مجھے اپنا منہ چھپانے دو۔ ماتم میں گم ہو جانے دو
کیونکہ میرا دل رنج و غم سے لبریز ہے
آؤ اور تھوڑی دیر میرے ساتھ قائم کرو
ایسا نہ ہو کہیں ہم بھول جائیں کہ
ایک پاکیزہ غم نہایت ہی پاکیزہ فعل ہے۔

فروری ۱۹۳۲ء میں حافظ ابراہیم کتب خانے کی ملازمت سے الگ ہو گئے۔ ان کے ایک دوست کا بیان ہے کہ اب ان کا ارادہ سارا وقت شاعری میں صرف کرنے کا تھا۔ وہ کہتے تھے میں نہایت عمدہ اشعار لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ماہ جولائی میں ایک دن وہ اچانک بیمار ہو گئے اور اسی شب عالم جاودانی کی راہ لی

۲۔ ملک الشعرا ——— احمد شوقی بے

احمد شلوقی کا سن ولادت ۱۸۶۸ء ہے۔ ان کا باپ سرکاری ملازمت میں ایک معمولی سے عہدے پر کام کرتا تھا مگر شوقی بے کو فخر تھا کہ ان کے آبا و اجداد میں مصریوں کے علاوہ عرب، ترک، یونانی اور چرکسی بھی شامل ہیں۔ اپنے والد کے حسب منشا شوقی بے نے ابتدائی تعلیم کے بعد قانون کی تحصیل شروع کی۔ اس غرض سے انہیں فرانس بھیجا گیا۔ یہاں مونت پلیر میں ان کا قیام رہا۔ فرانسیسی کسانوں اور زمینداروں سے شوقی بے کے تعلقات نہایت عمدہ تھے۔ وہ ان سے بہت مانوس تھے اور اکثر مختلف مسائل پر گفتگو کرتے۔ ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ یورپ میں اقامت کا اثر ان پر کس قدر گہرا تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنی پہلی تمثیل "علی بے الکبیر" لکھنا شروع کی۔ یہ تمثیل ممالیک سے متعلق ہے۔

یورپ سے واپس آکر شوقی بے خدیو کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ یہاں انہوں نے متعدد قصیدے، رباعیاں اور مرثیے لکھ ڈالے جن سے ہر طرف ان کا چرچا ہونے لگا۔ ادبی لحاظ سے شوقی بے کی یہ نظمیں نہایت بلند تھیں مگر معناً انہیں کوئی گہرائی نہیں تھی سوائے ایک خصوصیت کے یعنی بداعت۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ حافظ ابراہیم کو احمد شوقی سے کہیں زیادہ انقلاب پسند سمجھا جاتا ہے اور وہ تھے بھی لیکن حافظ کا قیام ہمیشہ مصر میں رہا برعکس اس کے شوقی بے کو چند سال جلاوطنی میں بسر کرنا پڑے یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ حکومت نے ان کے لئے سرزمین اندلس کا انتخاب کیا۔ چنانچہ جنگ عظیم کا سارا زمانہ شوقی بے نے اندلس میں گذارا ۱۹۲۰ء میں جب انہیں مصر واپس آنے کی اجازت ملی ہے تو شوقی بے اپنے ساتھ بہت سی نظمیں بھی لائے جو اندلسی طرز میں لکھی گئی ہیں۔ نظموں کے علاوہ ان کے ساتھ ایک نئی تمثیل "اندلس کی شہزادی" کا مواد بھی تھا۔ قاہرہ کے اوپیرا ہاؤس میں ان کا زبردست استقبال ہوا۔ یہاں انہوں نے ایک نظم پڑھی جس میں وہ کہتے ہیں:۔

"آخر میں پھر واپس آگیا۔ حالانکہ امید ختم ہو چکی تھی

اے میرے وطن میں نے کھویا ہوا شباب پھر حاصل کر لیا
اسی طرح جیسے ہر گم کردہ راہ اور تنہا خانہ بدوش
اگر خدا چاہے تو ایک دن گھر واپس آجاتا ہے
لیکن اگر مری قسمت میں یہ نہ ہوتا
تو میں تم کو اپنا مذہب بناتا
اور تم مری نمازوں کے قبلہ ہوتے
نہیں نہیں میں تمہاری حفاظت میں موت سے دست و گریبان ہو جاتا!

جب یہ کہا جاتا ہے کہ احمد شوقی بے درباری شاعر تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حافظ کس طرح اپنی قوم کے ہمدرد اور وطن کے پرستار نہیں تھے۔ احمد شوقی کا دل مصر کی محبت سے لبریز ہے اور اسلام کے تو وہ نہایت سچے عاشق تھے۔ آنحضرت صلعم کی ولادت مبارک پر انہوں نے جو نظم لکھی ہے وہ اس وقت مصر کے بچے بچے کی زبان پر ہے۔

احمد شوقی کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ عربی شاعری میں کوئی نیا اسلوب پیدا کریں۔ جدت اور بداعت طرازی کا انہیں ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ انہوں نے غالباً اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے خلفائے راشدین کی ابتدائی تاریخ پر ایک طویل رزمیہ لکھی جیسے عربی شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز سمجھنا چاہئے۔ ان کی یہ کوشش اگرچہ کچھ بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئی لیکن انہوں نے ظاہر کر دیا کہ عربی زبان میں بھی رزمیہ نظمیں لکھی جا سکتی ہیں۔

مرثیہ نگاری میں بھی شوقی کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ سعد زاغلول پاشا کے مرثیے کا آخری بند ملاحظہ ہو:۔

میرا قلم کہاں ہے؟
اور اس کی روانی کیا ہوئی؟
سعد کے ماتم میں اسے جنبش کیوں نہیں ہوتی؟

میرا قلم بار بار رکتا ہے اور اس دوست کا ماتم نہیں کرتا
جس کی روح آج اپنے خالق حقیقی سے جا ملی ہے،

جس نے دنیا کی نعمتوں میں اپنے رب کو فراموش نہیں کیا
جو کبھی عقل کے فریب میں نہیں آیا۔
نہ اشیا کے محدود علم نے اسے دھوکا دیا۔
جس نے اپنے شک و شبہات کو دور کر کے ہمیشہ خدا پر ایمان رکھا۔
جسے معلوم تھا کہ یہ دنیا فانی ہے، بے ثبات ہے، مگر اس کے ماورا ایک عالم ہے، جاودانی۔
جس کا قدم ہمیشہ خدا کے حکم پر اٹھتا تھا
آخر اس نے خدا کا حکم قبول کیا اور اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بداعت اور جدت طرازی کی خواہش نے شوقی کے سامنے دو مسائل پیش کر دیئے تھے۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ جدت کی شکل کیا ہو اور دوسرا عروض کا جس کے ساتھ لغت کی بحث ناگزیر تھی۔ باعتبار شکل شوقی بے نے غنائی تمثیل کی بنیاد ڈالی اور باعتبار لغت عام الفاظ اور محاورات کا استعمال شروع کر دیا۔ انہوں نے قصائد کی بعض شکلوں کو چھوڑ دیا۔ کچھ قوافی بھی ترک کر دیئے اور غنائی تمثیل کے شوق میں ایک ناممکن بات کو ممکن بنا دیا۔ عرب پیدائشی ممثل Actor ہے اور اس سے بے حد لطف اندوز ہوتا ہے۔ جب تھیٹر کا رواج ہوا تو مصر میں اسٹیج کے لئے کوئی تمثیل نہیں ملتی تھی۔ زیادہ تر انگریزی یا فرانسیسی تمثیلات کے ترجموں کا استعمال ہوتا تھا مگر ان کی ادبی حیثیت بہت پست تھی۔ شوقی بے کی تمثیلات سے یہ کمی پوری ہو گئی۔ ان کی تمثیلات ہر لحاظ سے کامیاب ہیں اور کسی طرح بھی مغربی تمثیلات سے کم نہیں۔

لیلیٰ اور مجنوں ان کی مشہور تمثیل ہے اور اگرچہ اس کا لطف شروع سے لے کر آخر تک قائم رہتا ہے مگر اس کے بعض حصے فی الواقعہ لاجواب ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شوقی بے کس قدر ذہین اور طباع انسان تھے۔ لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔

۱۹۳۲ء میں جب شوقی بے کا انتقال ہوا تو ان کی شاعرانہ عظمت انتہائے عروج پر تھی۔ یہ وقت تھا جب ان کے قلم سے بڑی بڑی نادر اور بے مثل چیزیں نکل رہی تھیں اور اگر موت نے ان کے سلسلۂ حیات کو دفعتاً ختم نہ کر دیا ہوتا تو معلوم نہیں ان کا شاعرانہ کمال ابھی کس کس مشکل میں ظاہر ہوتا۔

آثار و مقامات

غرناطہ

(ایک انگریز ادیب کے تاثرات بحوالہ اسٹیٹسمین)

"غرناطہ سے ہر شخص ایک نیا تاثر لے کر آتا ہے۔ کسی کو رنگ کی تلاش ہوتی ہے کسی کو منظر کی۔ لیکن اگر آپ مشرق کا سفر کر چکے ہیں، مسیحی یورپ سے واقف ہیں اور پھر سرزمین اندلس میں قدم رکھتے ہیں تو غرناطہ کا حسن آپ کے لئے غیر معمولی سحر اور دلکشی کا باعث ہوگا۔ اس سحر اور دلکشی کے بہت سے قصے مشہور ہیں لیکن آپ کی آنکھیں وہ کچھ دیکھتی ہیں کہ جس کی آپ کو توقع ہی نہیں تھی۔ ایک لحظے کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی خیالی اور غیر واقعی دنیا میں کھڑے ہیں۔ بیشک طلیطلہ کی پختہ گلیوں سے عربوں کے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کہیں کہیں آپ کو کوئی عربی کتبہ بھی مل جاتا ہے مگر پاس ہی قوطی وضع کے کلیسا کو دیکھ کر جو ازمنۂ متوسطہ کی مسیحی شان و شوکت کی ایک زبردست یادگار ہے یہ تمام اثرات کافور ہو جاتے ہیں۔

برعکس اس کے غرناطہ اور الحمرا اس دنیا کی یادگار ہیں جو اگرچہ اسپین سے ناپید ہو گئی لیکن مشرق میں اب بھی موجود ہے یا یوں کہئے کہ اگرچہ مسلمان ناپید ہو گئے مگر ان کی دنیا اب بھی باقی ہے۔ کاتولیکی اسپین میں اس عجیب و غریب دنیا کو دیکھ کر ایک نہایت ہی لطیف کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ الحمرا کی بلندیوں سے نیچے قوطیت، نشاۃ الثانیہ اور باروک سبھی اثرات موجود ہیں۔ اوپر صرف چارلس پنجم کا ویران شدہ محل ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے عیسائیت سے آزاد۔

کہا جاتا ہے الحمرا میں ہر جگہ پلستر اور ڈھالی ہوئی چیزوں کا استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس میں کیا حرج ہے؟ یہ تو ایک طرح کی خوبی ہے کہ جب ضرورت ہو الحمرا کی آرائشوں کو از سر نو طیار کر لیجئے۔ اس سے الحمرا کے حسن و نفاست اور سکون و اطمینان کی اس کیفیت میں جس کا راز کچھ خانہ بدوش عرب ہی کو معلوم تھا کوئی فرق نہیں آتا۔ الحمرا کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ دنیائے اسلام میں عیسائیوں کی نسبت کہیں زیادہ وحدت اور یکرنگی موجود ہے۔ ناممکن ہے کہ "صحن ریاحین" کے سفید مرمریں پتھروں اور وسطی حوض کو دیکھ کر تاج کی یاد تازہ نہ ہو جائے (اگرچہ تاج کا منظر زیادہ شاندار ہے)۔ پھر اگر آپ ایک صحن کو چھوڑ کر دوسرے کا رخ کریں۔ ان کے اشجار اور باغیچوں کا لطف اٹھائیں۔ نرم و نازک ستونوں، صاف و شفاف پانی، فواروں اور تالابوں کو دیکھیں چھتوں اور طاقچوں کے خمیدہ قبوں، نیلے نیلے سفالوں کے کناروں اور

عربی نقش و نگار پر نظر دوڑائیں۔ کیا آپ محسوس نہیں کریں گے کہ آپ پھر ایران میں آگئے ہیں ۔ ایک ایرانی یہاں آئیگا اور بلا تکلف کہہ اٹھے گا

اگر فردوس بر روئے زمین است ، ہمین است و ہمین است و ہمین است

یہ عرب کی دنیا تھی ۔ اس کے مقابلے پر سلسلۂ کارپنتھین سے بلقان اور بلقان سے بحیرۂ روم کی راہ لیجئے ۔ ترکوں کے آثار میں صرف چند منارے باقی ہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں مسلمان اب بھی موجود ہیں اور سراجیو اور سجکیا میں موذن کی آواز ہمیشہ سننے میں آتی ہے ۔ لیکن غرناطہ میں نہ کوئی مسجد ہے نہ مسلمان ۔ عیسائیت نے دنیا کے لئے بہت کچھ کیا مگر افسوس ہے اس میں رواداری کا وصف کبھی پیدا نہ ہوا ۔ اس وقت بھی بلقان میں جہاں پرانی داستان پھر دہرائی جا رہی ہے میں نے عبد الحمید کی ایک مسجد پر صلیب کو لہراتے ہوئے دیکھا ۔

آج کا غرناطہ

۱۴۹۲ء میں غرناطہ فتح ہوا ۔ عیسائیوں کے لئے یہ بڑی شان و شوکت کا دن تھا مگر غرناطہ کے لئے زوال اور پست کا آبادی کے لحاظ سے وہ قدیم شہر کا ۱/۵ واں حصہ بھی نہیں ۔ اس کی شہرت کا سارا دار و مدار اس کی مٹی ہوئی عظمت پر ہے اور اب اس میں جو بھی رونق ہے سیر و سیاحت کے دم سے لیکن ایک طرح سے عرب کا انتقام ہنوز جاری ہے غرناطہ کے خوش باش شہری جو زیادہ تر عربوں کی اولاد ہیں عربی لباس پہن کر تصویریں کھنچواتے ہیں اور اپنی دکانوں کو عربی طرز اور عربی تحریروں سے ——— جن سے وہ بالکل نابلد ہیں ——— آراستہ کرتے ہیں ۔ یہاں عربی وضع کا ایک زبردست ہوٹل بھی ہے جس میں اگرچہ جدید ضروریات کا پورا پورا انتظام ہے لیکن جس کے عربی کتبوں کو سیاح اور زائر خاموشی سے دیکھتے ہیں اور ان کو عجیب و غریب نقش و نگار سمجھتے ہوئے واپس چلے جاتے ہیں ۔

یہاں تک تو خیر غنیمت تھا ۔ لیکن جب میں نے ایک دروازے پر "لا غالب الا اللہ" کے اوپر لفظ "سنیما ٹوگراف" لکھا ہوا دیکھا تو میرے منہ سے بے اختیار ایک سانس نکل گئی جو اپنی حسرت و مایوسی کے اعتبار سے ابو عبداللہ کے "دم والپسیں" سے کم نہ ہوگی ۔

جبال الثلج

غرناطہ جس وادی میں آباد ہے اس کے جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ "جبال الثلج" کا برف پوش سلسلہ چلا گیا ہے

غرناطہ کی شام نہایت حسین اور پرکیف ہوتی ہے۔ اس وقت جبال الثلج کی شفق آلود چوٹیوں کو دیکھئے تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس پُراسرار کوہستان کی طرف بڑھتے جائیے۔ موسم بہار میں تو ملاہسن (جبال الثلج کی بلند ترین چوٹی ۱۱۰۰۰ فٹ) تک پہنچنا ناممکن ہے۔ بایں ہمہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ دور تک چلا گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو غرناطہ کی سرسبز و شاداب وادی (Vega) میرے سامنے تھی اور پہاڑ کے ایک جانب سے دریائے شنیل (Genil) کے دہانے زور شور سے بہہ رہے تھے"

شاید یہی منظر تھا جسے دیکھ کر ایک عرب شاعر نے کہا تھا

لَمَّا بَكَىٰ فِيهَا الْغَمَامُ تَبَسَّمَا

(جب اس وادی میں بادل رویا تو وہ متبسم ہو گئی۔)

ترجمان القرآن

(از مولانا ابوالکلام آزاد)

جلد اول

۶۷ صفحات میں مقدمہ اور فہرست مضامین وغیرہ میں بھرے ہوئے صفحات سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے ہیں۔ اب کسی انسان کیلئے جو اردو میں لکھی ہوئی عبارت پڑھ سکتا ہے یہ عذر باقی نہ رہیگا کہ وہ قرآن کو اس حد تک نہیں سمجھ سکتا جسقدر قرآن چاہتا ہے کہ ہر شخص سمجھ لے۔ قیمت مجلد ہے

جلد دوئم

یہ جلد اپنی نوعیت میں پہلی جلد سے کہیں زیادہ ضخیم بالشان ہے یعنی حواشی زیادہ مفصل اور دلکش اور اہم مسائل پر مشتمل ہیں۔ (سورۂ اعراف سے سورہ مومنون تک) ہدیہ بلا جلد ہے مجلد ہے

ضروری اطلاع

قادیانی مذہب مصنفہ پروفیسر الیاس برنی

طباعت پنجم حجم ۱۱۶۰ صفحات

جدید اضافوں اور مزید معلومات کے ساتھ حال ہی میں شائع ہوئی شائقین فوراً طلب فرمائیں

کتاب خانہ طلوعِ اسلام ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور

ضربِ کلیم اور احمدیت

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

اس مضمون کی شانِ نزول یہ ہے کہ اکتوبر کی کسی اشاعت میں لاہور کے ایک قادیانی ہفت روزہ انگریزی اخبار "سن رائز" نے بغیر ہماری درخواست کے "ضربِ کلیم" پر ایک ریویو جسے ریویو کہنے سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہوگا، شائع کر دیا۔ قادیان کے ذوقِ سخن سے تو ہمیں پہلے بھی کوئی توقع نہ تھی۔ لیکن اس تنقید کو دیکھ کر اور بھی تعجب ہوا۔ معلوم ہوتا تھا تبصرہ نگار کے ذہن میں صرف دو باتیں ہیں۔ ذاتی کدورت اور بے مائیگی کا تلخ احساس اور ہر ایسی آواز کو جو مسلمانوں کیلئے زندگی اور بیداری کا پیغام لائے اپنے شور و غوغا میں دبانے کی کوشش، تاکہ اندھیرے اور موت کا فریب قائم رہے یہی وجہ تھی کہ پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی کو پوری وضاحت کے ساتھ بتلانا پڑا کہ احمدیت نے سیاست اور مذہب کو کیسے کیسے مغالطوں میں الجھا رکھا ہے اور جب تک یہ ملک تنزل اور انحطاط کے جہالت آفریں اثرات سے آزاد نہیں ہوتا برابر الجھاتی رہے گی۔ ہمیں افسوس ہے کہ طلوعِ اسلام کا مجبورانہ التوا اس مضمون کی اشاعت میں حائل رہا۔

مدیر

ضربِ کلیم کی اشاعت پر اکثر اربابِ بینش کو یہ خیال ہوا تھا کہ احمدی حضرات اس کے بعض اشعار کو اپنی تعریض پر محمول کرینگے۔ چنانچہ ۱۰ اکتوبر کے سن رائیز میں جو "ریویو" اس کتاب پر شائع ہوا ہے اس نے اس خیال کی تصدیق کر دی۔ احمدی حضرات نے علامہ مدظلہٗ کے بعض اشعار کو "سلسلہ عالیہ" کی طرف منسوب کر کے قادیانی خانہ ساز نبوت کا راز اس خوبصورتی کے ساتھ فاش کیا ہے اور اپنی تضحیک کا ایسا دلکش سامان بہم پہنچایا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ غالباً اس لئے کسی دانا نے یہ کہا ہے کہ خدا انسان کو نادان دوستوں سے محفوظ رکھے۔

مدبر سن رائیز کو کیا خبر کہ اس کتاب میں افراد و اشخاص سے بحث نہیں کی گئی بلکہ فلسفیانہ طریق پر عہدِ حاضر کا تجزیہ کیا گیا ہے، اور اس کی غلط روش، غلط تعلیمات، غلط خیالات اور غلط منطق کی نہایت واضح الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔ افرنگ اور دانشِ افرنگ کے ساتھ ساتھ عرب و عجم اور ایران و ہندوستان

پر بھی تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور مسلمانوں کی حیات اجتماعیہ کے مختلف شعبوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے الغرض ضرب کلیم مغرب اور مشرق دونوں پر بے لاگ تبصرہ ہے، جسکی نظیر اردو تو کیا اس وقت تمام ایشیائی لٹریچر میں بھی ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں، اسلام کے انحطاط خیز رجحانات اور ملوکیت پسند تاویلات کی تشریح کے آئینہ میں جو علامہ کے قلم معجز رقم نے کی ہے، قادیان اور اربابِ قادیان کو اپنی صورت نظر آگئی۔ وگرنہ، ہم مدیر" سن رائیز کو یقین دلاتے ہیں کہ قادیانیت اس درجہ اہم نہیں کہ علامہ، اُس کے تذکرہ سے ضرب کلیم کے صفحات سیاہ فرماتے۔

اس ریویو کو پڑھنے کے بعد، جو چیز نمایاں طور سے نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ لکھتے وقت مدیر سن رائیز کا توازن دماغی قائم نہ رہ سکا یہی وجہ ہے کہ یہ ریویو ضرب کلیم پر تنقید کے بجائے، احمدیت کی تردید کی شکل میں بدل گیا۔

مدیر مذکور نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال جہاد کے قدیم پارینہ اور خونی تصور کے قائل ہیں، برطانی ملوکیت کے دشمن ہیں اور بے تیغ نبوت کو برگ حشیش سے تعبیر کرتے ہیں۔

لیکن جب ہم احمدیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریک جہاد کو منسوخ اور ناجائز قرار دیتی ہے، برطانی ملوکیت کی ثناخواں ہے بلکہ اُسے آیۂ رحمت سمجھتی ہے اور بے تیغ نبوت پر ایمان رکھتی ہے۔

جب صورت حال یہ ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مدیر مذکور ڈاکٹر صاحب سے اس قدر خفا کیوں ہیں؟ اور ان کی تنقید کو Obliquo remarks یعنی در پردہ تعریض کیوں سمجھتے ہیں؟ جب احمدیت اور اسلام میں جس کی تبلیغ ڈاکٹر صاحب کرتے ہیں، اس درجہ تفاوت ہے کہ بعد المشرقین نظر آتا ہے تو مدیر مذکور کو شکایت کرنے کا کیا حق ہے؟ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے مسلک کی اشاعت میں آزاد اور مختار ہیں، اگر اس کی بناء پر، تمہارے مسلک پر زد پڑتی تو کوئی کیا کرے؟ کیا علامہ موصوف محض اس خیال سے، اعلائے کلمۃ الحق سے باز رہیں کہ اُن کے کلام سے نظام کی ضرب سے احمدیت کے آبگینے چکنا چور ہو جائینگے؟

اگر ہم چوری کی مذمت کریں اور کوئی چور اس مذمت کو سُن کر یہ کہنے لگے کہ یہ مجھ پر درپردہ تعریض کی گئی ہے تو یہ اس کی اپنی سمجھ کا قصور ہے۔ اس معاملہ میں سوائے اس کے کہ اُس شخص کے ساتھ ہمدردی کی جائے اور چارہ کار ہی کیا ہے؟

قرآن مجید میں اس فعل کی بار بار مذمت کی گئی ہے۔ سوء اتفاق سے ابولہب نے خانہ کعبہ سے سونے کا ایک ہرن چرایا تھا لہٰذا جب کبھی وہ ان آیات کو جنہیں چوری کی مذمت کی گئی ہے سنتا تھا، تو یہی کہتا تھا کہ حضرت محمد (صلعم) نے درپردہ مجھ پر چوٹ کی ہے،

بعینہٖ یہی حال ہمارے احمدی دوستوں کا ہے حالانکہ بات بالکل صاف ہے تم ان تینوں باتوں کے قائل ہو، ڈاکٹر صاحب ان تینوں باتوں کے سخت مخالف ہیں اور ان کو علی وجہ البصیرت اسلام کی روح کے منافی خیال فرماتے ہیں۔ پھر تم ان کی تنقید کو پڑھ کر لعل در آتش کیوں ہوتے ہو اور ان سے وجہ شکایت کس لئے پیدا کرتے ہو؟ تمہارا مذہب اور، اُن کا مسلک اور وہ رہ نورد کعبہ تم عازم ترکستان! جب فیمابین، کسی جگہ اتحادِ خیال ہی نہیں تو اس واویلا کی کیا ضرورت ہے؟

آئیے! اب نہایت سکون قلب کے ساتھ ان حقائق سہ گانہ کا مذہبی اور عقلی زاویۂ نگاہ سے تجزیہ کر کے دیکھیں تاکہ ڈاکٹر صاحب کا مسلک زرّیں، ہر شخص پر روز روشن کی طرح ہویدا ہو جائے

(ا) اسلامی جہاد کی تعریف

اپنے مذہب یا اُس شے کی حفاظت اور بقا کی خاطر جسے انسان مقدس اور محترم سمجھتا ہو، اپنی زندگی تک قربان کر دینا۔ یہ اسلامی جہاد کی تعریف ہے۔ عقل، تاریخ اور مشاہدہ تینوں اس کی تائید کرتے ہیں۔

(۱) اگر کوئی شخص اپنے مذہب ثقافت (کلچر) یا مقدس روایات یا وطن عزیز کی حفاظت کے لئے بھی تلوار نہیں اُٹھا سکتا تو پھر خدا جانے اُس کی تلوار کس دن کام آئیگی؟ تلوار تو بنائی ہی اس لئے گئی تھی کہ اپنی جان مال اور دین و ایمان کی حفاظت و حمایت میں بلند کی جائے۔ اور یہی تعلیم اسلام کی ہے کہ اُس کو اُس وقت نیام سے باہر نکالا جائے جب دشمن تم پر یا تمہارے مذہب پر یا تمہارے ملک پر حملہ آور ہو۔

(ب) آنحضرت صلعم کا طرز عمل بھی **اسی حقیقت پر** شاہد ہے آپ نے اسلام کی اشاعت کے لئے یا لوگوں

کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے یا دوسروں کو ان کے وطن سے محروم کرنے کے لئے بھی ہرگز تلوار نہیں اٹھائی آپ نے بلاشبہ جنگوں میں حصہ لیا لیکن وہ سب دفع فتنہ کے لئے تھیں ۔

(ج) اپنے مذہب اور اپنے مقاماتِ مقدسہ مثلاً بہشتی مقبرہ اور منارۃ المسیح کی حفاظت کے لئے اپنا خون بہانے اور اپنی جانیں قربان کرنے کا اعلان خود قادیان کی سرزمین سے بھی کئی دفعہ ہو چکا ہے ۔

الغرض جہاد کرنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے ' ہر شخص کو دنیا میں جینے اور آزادی کے ساتھ اپنی مذہبی روایات پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر کوئی طاقت اس معاملہ میں اس کی مزاحم ہو تو اس کا مقابلہ کرنا، "حتیٰ یکون الدین کلہ للہ" سراسر قرینِ عقل و صواب ہے ۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان، جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ میں کسی مقدس مقصد کی تکمیل کر رہا ہوں' اس وقت تک اپنی تلوار نیام سے باہر نہیں نکال سکتا! انسان اس وقت جنگ کرتا ہے جب اپنے آپکو برسرِ حق یقین کرتا ہے۔ انسانی فطرت کے اس پہلو سے آگاہ ہیں اس لئے وہ' دنیاوی جنگوں کو بھی جنکا مقصد قتل و غارت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا مقدس بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہیں ۔ صلیبی جنگوں کا مقصد در اصل یہ تھا کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکا جائے لیکن حکومتوں نے پادریوں کی وساطت سے ان جنگوں کو "مقدس" قرار دلوایا تاکہ لوگ آمادۂ پیکار ہو سکیں ۔ حالانکہ صلیبی اقوام نے، ارضِ شام میں جس بربریت اور سفاکی کا مظاہرہ کیا اسے تقدس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔

خود ہمارے زمانہ میں جو محاربہ عظیم یورپ میں برپا ہوا ' برطانوی مدبرین نے ' اسے بھی پادریوں کے "مقدس" ہاتھوں سے تقدس کا بپتسمہ دلوایا ۔ چنانچہ کنٹربری کے اسقفِ اعظم نے اعلانات شایع کئے کہ شریکِ جنگ ہونے سے برطانیہ کو اپنا کوئی نفع مدِ نظر نہیں ہے ۔ اُس نے محض حق و صداقت کی حمایت میں تلوار اٹھائی ہے ۔ اور کمزوروں کی حمایت کی غرض سے شریکِ جنگ ہوا ہے ۔ حال ہی میں ایک انگریز مصنف نے جس کا نام Irene Cooper Wills ہے جنگِ عظیم کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "Englands Holy War" انگلستان کی جنگِ مقدس ۔ الغرض اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے تلوار چلانا' رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں بھی ممنوع تھا " لا اکراہ فی الدین " اور آج بھی

ممنوع ہے، اور اسلام کی حمایت اور حفاظت کے لئے تلوار اٹھانا ابتدائے اسلام میں بھی جائز تھا اور آج بھی جائز ہے، اور قیامت تک جائز رہیگا۔

مرزا صاحب سے جو غلطی دانستہ یا نادانستہ طور پر سرزد ہوئی وہ یہ تھی کہ انہوں نے اسلامی جہاد کے غلط معنی دنیا کے سامنے پیش کئے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

اے دوستو جہاد کا اب چھوڑ دو خیال
دیں کیلئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

ان دونوں مصرعوں میں جو لفظ "اب" آیا ہے اگرچہ ادبی زاویۂ نگاہ سے اس کی تکرار بہت مذموم ہے لیکن مرزا صاحب کی، اسلام سے ناواقفیت کا ثبوت دینے کے لئے بہت کافی ہے یعنی ان کا مطلب یہ ہے کہ دین کے لئے جنگ و قتال پہلے جائز تھا مگر اب جائز نہیں ہے۔ کس قدر عظیم الشان مغالطہ ہے جو انہوں نے دنیا کو دیا!

کاش انہیں تاریخ و فلسفہ اسلام سے واقفیت ہوتی! بندۂ خدا! دین کی اشاعت کے لئے جہاد کرنا پہلے کب جائز تھا، جو تم آج ناجائز قرار دے رہے ہو؟ اسلام پہلے کب بزور شمشیر پھیلایا گیا جو آج تم ناصح مشفق بن کر اس کی ممانعت کر رہے ہو؟

اگر جوع الارض کو تسکین دینے کے لئے یا ملوکیت اور شہنشاہیت قائم کرنے کے لئے یا بے گناہ اقوام کو غلام بنانے کے لئے 'جہاد' کیا جائے تو وہ جہاد ہی کب ہے؟ وہ تو غارت گری ہے۔ خود علامہ فرماتے ہیں :-

جنگ شاہانِ جہاں غارت گری است
جنگِ مومن سنت پیغمبری است

تعجب ہوتا ہے تعلیمیافتہ احمدی حضرات پر کہ یہ لوگ کیونکر اس سفسطہ کا شکار ہو سکتے ہیں؟ کیا احمدیوں میں کوئی ایسا روشن خیال انسان نہیں جو اسلامی فلسفہ و تاریخ کا مطالعہ کر کے اس مغالطہ کی دلدل سے باہر نکل سکے؟ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو سکتی ہے کہ اسلام میں جہاد کا

معنیٰ اور مفہوم کیا ہے؟ جنگ اور قتال اگر اس کا محرک ہوس ملک گیری اور استعماری حکمت عملی ہو تو یہ بات اسلام میں کبھی بھی جائز نہ تھی پھر مرزا صاحب اپنے اس "الہامی شعر" میں کس چیز کو حرام قرار دے رہے ہیں؟ اسی بات کو نا، جو پہلے ہی سے حرام ہے تو حرام کو حرام قرار دینا یہ کون سی دانشمندی ہے؟ اور اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ خطرہ کے وقت بھی مسلمانوں کا اپنے مذہب کی حمایت میں تلوار اٹھانا حرام ہے تو وہ مذہب اسلام سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں سے قادیانی حضرات جو صورت پسند کریں اختیار فرمالیں، مرزا صاحب کی علمی اور مذہبی پوزیشن بہرحال متزلزل ہو جائیگی۔ اگر پہلی صورت صحیح ہے تو مرزا صاحب مغالطہ کے مرتکب ثابت ہوتے اور دوسری صورت کو تسلیم کیا جائے تو اسلام کے اصولوں سے کورے نظر آتے ہیں۔

اسی لئے حکیم الامت علامہ اقبال مدظلہ نے مسلمانوں کو مرزا صاحب اور مرزائیت دونوں کی غلط تعلیمات سے محفوظ کر لینے کے لئے اسرار خودی میں اس حقیقت کو آشکار فرما دیا ہے کہ اسلام میں جہاد کے معنیٰ یہ ہیں کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد وحید اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور اگر کوئی طاقت مسلمان کو اس کے اس مذہبی فریضہ کی تکمیل سے باز رکھنا چاہے یا اس میں مزاحمت کرے تو وہ حق و صداقت کی حمایت میں تلوار اٹھا سکتا ہے لیکن وہ جہاد جس کا مقصد جوع الارض ہو، تسخیر ممالک ہو یا قتل و غارت گری ہو، اسلام میں بالکل حرام ہے، چنانچہ علامہ فرماتے ہیں۔

ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
تیغ او در سینۂ او آرمید

اب جو شخص بھی مرزا صاحب کے مذکورہ بالا شعر کو پڑھیگا وہ لامحالہ یہی سمجھیگا کہ دین کی اشاعت کے لئے پہلے اسلام میں جنگ و قتال جائز تھا یعنی (نعوذ باللہ) قرونِ اولیٰ میں اسلام کی اشاعت اس کے پاکیزہ اصولوں کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ تلوار کے زور سے ہوئی اور تیرہ سو سال کے بعد جا کر مرزا صاحب نے اس بات کو حرام قرار دیا ہے۔

معلوم نہیں مرزا صاحب نے جہاد کے متعلق یہ غلط خیال کیوں پھیلایا۔ شاید حکومت کی نظر و نمیں عزت حاصل کرنیکیلئے

ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دین کی اشاعت کے لئے تلوار چلانا رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں بھی جائز نہ تھا اور نہ قرآن مجید کی اس صریح آیت کی موجودگی میں (لا اکراہ فی الدین) کسی کو بزور شمشیر مسلمان کرنا جائز ہو سکتا ہے اور اسلام تو سرتاپا معقولیت پسند مذہب ہے وہ کب اس بات کو روا رکھ سکتا ہے کہ لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جائے؟

اگر دین کے لئے جنگ و قتال مرزا صاحب سے پہلے حلال ہوتا تو ڈاکٹر آرنلڈ جو ایک سچا مسیحی تھا، اور یقیناً مسلم نہ تھا، کس طرح اپنی مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام مرتب کر سکتا تھا؟ اس کتاب میں اس منصف مزاج انگریز نے اسلامی تاریخ کی بنا پر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچا دی ہے کہ اسلام اپنی ابتداء سے آج تک تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔(۵)

(۲) قادیان کے مسلک جاسوسی پر عمل کرنے کے لئے دوسرا اعتراض مدیر سن رائیز نے یہ کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اسلامی ممالک پر برطانی اقتدار کو ناپسند کرتے ہیں اور دولِ مغرب کی استعماری حکمت عملی کے خلاف ہیں جہاں تک میں نے غور کیا اس باب میں بھی، مدیر مذکور کی ناراضگی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تمہارا مسلک انگریزوں کی غلامی ہے، تمہیں مبارک ہے، ڈاکٹر صاحب کا مسلک (رس حریت و آزادی ہے) وہ انہیں مبارک رہے، آخر تم

---

(۵) خواجہ کمال الدین جو مرزا صاحب کے نہایت معتمد اور وفادار مریدوں میں سے تھے، اپنی کتاب ینابیع المسیحیت کے ضمیمہ موسومہ اسلامی اصول جنگ میں رقمطراز ہیں "بعض اوقات ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ انسان کے لئے اپنے دین کی حمایت میں تلوار اٹھانا ناگزیر ہو جاتا ہے، چنانچہ [illegible] قوم کی غلامی کا احساس تکلیف نہیں دیتا تھا اور اگر انہیں موقع ملتا تو کیا وہ اپنی قوم کی بہبود کیلئے مدافعانہ جنگ کا اعلان کرتے"۔ [illegible] کو دوسرے لفظوں میں جہاد کہتے ہیں۔ [illegible] کہ مرزا صاحب کے ایک قابل اور تعلیم یافتہ مرید، جنہوں نے برسوں اپنے مرشد کی صحبت [illegible] کی حمایت میں تلوار اٹھا سکتا ہے۔

ہماری رائے میں مناسب ہے کہ قادیانی اور لاہوری فریق پہلے آپس میں تبادلۂ خیال کر کے یہ فیصلہ کر لیں کہ خواجہ صاحب کا نظریہ [illegible] احمدیت کے مطابق ہے یا مخالف۔

کو ان پر اعتراض کرنے اور ان کی تعلیم پر ناک بھوں چڑھانے کا کیا حق حاصل ہے۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے مسلک کی یا اس بات کی جسے وہ **صحیح** سمجھتا ہے **تبلیغ کرے** اور بلا خوف و خطر **تبلیغ کرے۔ دیکھنا اگر ہے** تو یہ اور غور کے قابل اگر کوئی بات ہے تو یہ کہ کس کی تعلیم منشائے اسلام کے مطابق ہے:

قادیانیوں کے مذہب میں مسلمانوں کو غلامی کا سبق پڑھانا جائز بلکہ فرضِ عین ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب خود لکھتے ہیں کہ ہمارے مذہب کے دو خاص جزو ہیں ایک خدا کی اطاعت دوسرا گورنمنٹ برطانیہ کی اطاعت، اور ان کی تمام عمر مسلمانوں کو درس غلامی دینے اور ان کے جذبات حریت کو فنا کرنے میں گزری، اور کیوں نہ گزرتی؛ وہ اپنے قائم کردہ سلسلہ کو، جسے وہ حقیقی اسلام کہتے تھے، سرکار انگلشیہ کا "خود کاشتہ پودا" قرار دیتے ہیں اور اس بات کو بڑے فخر و مباہات سے بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو اسلام برطانیہ کے زیر حمایت سرسبز ہو وہ یقیناً اس اسلام سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، جس کی صداقت کا آفتاب فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا تھا وہ اسلام تو دنیا میں حریت اور آزادی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اس میں دوئی کی مطلق گنجائش نہیں، وہ تو صرف ایک ذات مطلق کی اطاعت کا حکم دیتا ہے اور وہ ذات اللہ ہے۔ چنانچہ مسلمان صرف اللہ کا مطیع ہو سکتا ہے، غیر اللہ کے سامنے اس کی گردن قیامت تک نہیں جھک سکتی۔ شریعت کا مسئلہ ہے کہ دنیاوی حکومت کا کوئی حکم، خدا کے حکم کے خلاف ہو تو مسلمان کا فرض اولین یہ ہے کہ غیر اللہ کے حکم کو ٹھکرا دے۔ چنانچہ اسوۂ حسینیؓ اس پر شاہد عادل ہے:۔

تا قیامت قطع استبداد کرد
موجِ خون او چمنِ ایجاد کرد

تاریخ شاہد ہے کہ انبیاء اپنی قوم کو درس حریت دینے کے لئے مبعوث ہوا کرتے ہیں حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو مصریوں کی غلامی سے نجات دلائی، حضرت داؤد نے اپنی قوم کو حکومت اور طاقت عطا کی، حضرت عیسیٰ نے بھی یہود کو رومیوں کی غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کی، حضرت خاتم المرسلین صلعم نے بھی اپنی قوم کو حکومت اور طاقت عطا کی لیکن چودھویں صدی ہجری میں جو نبی "پیدا ہوا" اس نے اپنی تمام عمر قوم کو غلامی کا درس دیا اور

گفت دیں را رونق از محکومی است — زندگانی از خودی محرومی است

دولت اغیار را رحمت شمرد — رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد

اگر مرزا صاحب کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد ہوتا تو وہ کبھی اپنی قوم کو اغیار کی غلامی کا درس نہ دیتے لیکن وہ تو تمام عمر منارۃ المسیح بہشتی مقبرہ اور توسیع مکان کی تکمیل کی فکر میں سرگرداں رہے، قوم کی فکر انھیں کب اور ہوتی بھی تو کیونکر؟

اس کے برخلاف، علامہ کے دل میں اپنی قوم کا درد ہے اور یہی درد تو انہیں مسلمانوں سے اس طرح خطاب کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

اے مسلمان! اندریں دیرِ کہن — تا کجا باشی اسیرِ اہرمن؟

زیستن تاکے بہ بحر اندر چو خس — سخت شو چوں کوہ از ضبطِ نفس

پھر کہتے ہیں :-

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ — تا کجا در قیدِ زنّارِ فرنگ؟

زخم ازو نشتر ازو سوزن ازو — ما و جوئے خون و امیدِ رفو؟

یہی درد تو انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے افراد کو بیداری، سخت کوشی اور جدوجہد کا پیغام دیتے ہیں

شیخ ملت با حدیثِ دل نشیں — بر مرادِ او، کند تجدیدِ دیں

(۳) تیسری بات جس پر مدیر مذکور ڈاکٹر صاحب سے خفا ہیں یہ ہے کہ وہ بے قوت و شوکت نبوت کو برگِ حشیش سے تعبیر کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم خود تسلیم کرتے ہو کہ مرزا صاحب قادیانی کی نبوت بے قوت تھی تو پھر ڈاکٹر صاحب نے اُسے برگِ حشیش سے تعبیر کیا تو کیا بُرا کیا؟ کیا دو اور دو کو چار کہنا بھی جرم ہے؟ بلاشبہ

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش — جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

ڈاکٹر صاحب نے اس شعر میں مرزا صاحب کا نام نہیں لیا صرف ایک حقیقت بیان کی ہے لیکن تم نے اس شعر کو اُن کی طرف منسوب کر کے خود پردۂ نبوت کو چاک چاک کر دیا۔

تم بے قوت نبوت کو آیۂ رحمت سمجھتے ہو، ڈاکٹر صاحب اسے برگِ حشیش تصور فرماتے ہیں پھر جب فی ما بین

انحاد خیال ہی نہیں تو ڈاکٹر صاحب سے شکوہ کس بات کا ہے ؟

چونکہ ڈاکٹر صاحب ایسی نبوت کو برگ حشیش سمجھتے ہیں اس لئے ان کا فرض تھا کہ مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیں کہ ایسی نبوت جو مسلمانوں کو غلامی کا سبق پڑھائے، ان کے حق میں برگ حشیش سے کم نہیں ۔ علامہ نے مسلمانوں کو اس فتنہ سے آگاہ کر کے اپنا وہ فرض ادا کیا ہے جو حکیم الامت، مصلح قوم اور دانائے راز ہونے کی حیثیت سے اُن پر عائد ہوتا تھا ۔

خدارا ہمیں یہ تو بتایا جائے کہ مرزا صاحب کی اس نبوت اور اُن کے لاتعداد الہامات سے مسلمانوں کو من حیث القوم کیا فائدہ پہنچا ؟ نبوت بلاشبہ رحمت الٰہی ہے لیکن اُس نبوت کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے جو قوم کی غلامی کی زنجیروں کو اور زیادہ مضبوط کرے ؟

اس وقت ہمارے سامنے یہ سوال نہیں کہ مرزا صاحب نے جو الہامات شائع کئے وہ صحیح تھے یا غلط ؛ سچے تھے یا جھوٹے ؟ سوال تو یہ ہے کہ خدائے قدوس نے جو الہامات ان پر نازل فرمائے ہمارے لئے ان کی قیمت (Value) کیا ہے ؟ کیا ان کی مدد سے یا ان پر عمل کرنے سے مسلمانوں کی موجودہ سیاسی، اقتصادی، اور تمدنی مشکلات کا خاتمہ ہو سکتا ہے ؟

آج مسلمان جن روح فرسا مصائب سے دوچار ہیں ان میں دو سب سے اہم ہیں اولاً استعمار پرستان مغرب کی وسیسہ کاریاں اور دست درازیاں ثانیاً افلاس اور اقتصادی بدحالی کیا مرزا صاحب کے الہامات میں مسلمانوں کی ان دو مصیبتوں کا کوئی علاج مل سکتا ہے ؟

ایک دنیا اس حقیقت کا اعتراف کر رہی ہے کہ مسلمان روبزوال ہیں اور اُن کے زوال کا اصلی سبب بے زری نہیں، بلکہ رگوں میں خون کا سرد ہو جانا، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سرد شدہ خون کو از سر نو گرمایا جائے، کیا مرزا صاحب کے الہامات مثلاً (۱) ربنا العاج (۲) بست روپیہ آنے والے ہیں (۳) پیٹ پھٹ گیا (۴) شاتان تذبحان وغیرہ لک کے ورد زبان کرنے یا ان پر عمل کرنے سے مسلمانوں میں شان کراری پیدا ہو سکتی ہے ؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے ان کے تمام الہامات ارشادات ملفوظات اور تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ غلامی پر قناعت کرو اور دن رات انگریزی حکومت کے گن گاتے رہو ۔ محکوموں کے ورد کا مداوا یہ نہیں کہ انہیں غلامی کا سبق پڑھایا جائے، آج ہمیں مفلوح اور مجہول

بنانے والے الہام کی ضرورت نہیں بلکہ ایسے الہام کی جو مردہ رگوں میں حیات پیدا کر سکے

دنیا کو ہے اُس مہدیٔ برحق کی ضرورت

ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

جو نبوت قوم کے افراد کو آغوش غلامی میں سُلانے کی کوشش کرے وہ برگِ حشیش نہیں تو اور کیا ہے ؟

الہامات شائع کرنے کے علاوہ دوسرا کارنامہ مرزا صاحب کا پیشگوئیاں شائع کرنا، اور ان کو اپنی صداقت کا نشان ٹھہرانا ہے کما قال،

ہاں! مکر جلدی سے انکار اے سفیہہ ناشناس   اس پہ ہے میری سچائی کا سبھی دار و مدار

(مرزا صاحب قادیانی)

لیکن وہی سوال یہاں بھی درپیش ہے کہ ان متعدد پیشگوئیوں کے شائع کرنے سے، جن میں سے اکثر و بیشتر پوری نہیں ہوئیں۔ مسلمانوں کو کیا دینی یا دنیاوی فائدہ پہونچا؟ ہاں مرزا صاحب کی جودتِ طبع کی داد ضرور دینی چاہئے کہ جب کسی پیشگوئی کے پورا نہ ہونے کے بعد مریدانِ باصفا، اس کی وجہ ان سے دریافت کرتے تھے تو وہ نہایت تسلی بخش جواب دے دیا کرتے تھے۔ مثلاً جب آتھم والی پیشگوئی اور محمدی بیگم والی پیشگوئیاں پوری نہ ہوئیں تو انہوں نے متشککین کی تسلی یہ کہہ کر کردی کہ میری پیشگوئیوں میں عموماً ایک پہلو مخفی ہوتا ہے، جس شخص کے متعلق کی جاتی ہے اگر وہ دل میں ڈر جائے تو پیشگوئی التواء کے دفتر میں منتقل ہو جاتی ہے

اس جواب کو منطقی پیرایہ میں یوں بیان کر سکتے ہیں

سوال :- آتھم کو سزا کیوں نہیں ملی ؟

جواب :- وہ دل میں ڈر گیا تھا۔

سوال :- اس کے دل میں ڈرنے کا کیا ثبوت ہے ؟

جواب :- کیونکہ اسے سزا نہیں ملی۔

یہ ہے قادیانی منطق! جس پر یونانی سوفسطائیوں کی ارواح بھی وجد کر رہی ہونگی لیکن تعجب تو یہ ہے کہ اچھے خاصے تعلیمیافتہ احمدی بھی اس منطقی مغالطہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مرزا صاحب کو مسئلہ کے اس شعبہ سے خاص دلچسپی تھی چنانچہ ان کی تحریرات میں اس قسم کی مثالیں بہت موجود ہیں، ایک مثال اور ملاحظہ ہو :-

جب مرزا صاحب نے بہشتی مقبرہ کی تعمیر کا اعلان شائع کیا تو لامحالہ یہ اعتراض وارد ہوا کہ جناب! پھر تو ایمان اور اعمالِ صالحہ کی ضرورت ہی نہ رہی، جس کسی نے بہشتی مقبرہ میں مدفون ہونے کا انتظام کر لیا اُسے نجات کا سرٹیفکیٹ بلکہ یوں کہئے کہ بہشت کا پاسپورٹ مل گیا، تو آپ کے تعمیر کردہ بہشتی مقبرہ میں اور پاپائانِ روم کے "تذکرۃ الغفران" میں کیا فرق باقی رہا؟ سوال معقول تھا لیکن قربان جائیے مرزا صاحب کے ذہن رسا کے، جواب بھی ترشا ترشایا لکھا تھا، فرماتے ہیں :-

"میں یہ تو نہیں کہتا کہ جو شخص اس مقبرہ میں مدفون ہوگا وہ بہشتی ہو جائیگا لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ بہشتی لوگ ہی اس مقبرہ میں مدفون ہونگے" سارے مریدانِ باصفا کی اس معقول جواب سے تسلی ہوگئی، اور آج "شیخ کلیسا" کی یہ زندہ یادگار، زبانِ حال سے جملہ احمدیانِ کرام کو مژدۂ بہشت سنا رہی ہے۔ چنانچہ جائدادیں وقف ہو رہی ہیں، کتبے لگائے جا رہے ہیں اور ان کو دیکھ دیکھ کر ایمان تازہ ہو رہا ہے۔ سچ کہا ہے کسی عقلمند نے کہ "یہ دنیا کبھی سادہ لوحوں سے خالی ہوئی ہے نہ آئندہ ہونے کی امید ہے"*

---

* لیکن اس قسم کی تاویل کی ایجاد کا سہرا بھی مرزا صاحب کے ایک پیشرو مختار کے سر پر ہے یہ وہ شخص ہے جس نے امام حسینؓ کے دشمنوں سے جنگ کی تھی اور اس طرح حامیان آلِ علی کی ہمدردی اسے حاصل ہوگئی تھی۔ موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈال دی جسے تاریخ میں کیسانیہ کا نام دیا گیا ہے۔ مختار نے مامور من اللہ اور ملہم ربانی ہونے کا دعویٰ کیا اور بہت سے سادہ لوح اس کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگئے۔ آگے چل کر اس نے پیشگوئیوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جن میں سے اکثر پوری نہیں ہوئیں۔ اس پر اسکے بعض منچلے مریدوں نے اس سے سوال کیا کہ حضرت! یہ کیا بات ہے کہ آپکی فلاں پیشگوئی، جس کے متعلق آپ نے نہایت وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ ضرور پوری ہوگی، پوری نہ ہوئی۔ مختار نے کہا میں دو دن کے بعد اس سوال کا جواب دونگا۔ سوال مشکل تھا لیکن مختار کے جودت مآب دماغ نے عین وقت پر اس کی امداد کی اور جو جواب اس نے دیا وہ آج، شیعہ علم کلام کا ایک اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے جسے بداء کہتے ہیں وہ یہ تھا کہ خدا پہلے ایک کام کا ارادہ کرتا ہے اور اس سے اپنے مقربین بارگاہ کو مطلع کر دیتا ہے لیکن پھر کسی وجہ سے ارادہ بدل دیتا ہے، اس لئے وہ بات پوری نہیں ہوتی اور محدود الفہم انسانوں کو دھوکہ لگ جاتا ہے۔

سچ پوچھا جائے تو ہمیں تو مرزا صاحب سے دلی ہمدردی ہے نہ اُن کو اسلامی تاریخ سے واسطہ تھا نہ مسیحیت کی تاریخ سے کوئی علاقہ۔ ان کی ساری عمر "مثیل مسیح" کا دعویٰ کرنے میں گزر گئی لیکن انہیں آخر وقت تک یہ پتہ نہ چلا کہ میں کس مسیح کے مثیل ہونے کا دعویٰ کر رہا ہوں؟ آیئے مرزا صاحب کی معلومات کے اس پہلو کو بھی ذرا واضح کر دیں۔

جن لوگوں نے تاریخ یورپ اور اسلام اور مسیحیت کی تاریخ کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ موجودہ اناجیل یعنی عہد جدید، کا مسیح اور قرآن مجید کا مسیح دو مختلف اشخاص ہیں جن کو ایک دوسرے سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جس مسیح کا مذکور ہے وہ اللہ کے برگزیدہ رسول تھے، اور ان کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہود کو رومیوں کی غلامی سے نجات دلائیں۔ جیسا کہ شروع سے تمام انبیاء کا مقصد رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنی قوم کو درسِ حریّت دیا۔

جس طرح تمام سلطنتوں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو روا نہیں رکھ سکتیں کہ کوئی شخص، محکوموں کو اس برگ حشیش کا انار پلائے، جو ازل سے شہنشاہیت کے دسترخوان سے رعایا کو مفت تقسیم کیا جاتا ہے رومی حکومت بھی اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ جناب مسیح علیہ السلام، قوم یہود کو حریت کا سبق پڑھائیں یا ان کے دل میں لیلائے آزادی سے ہمکنار ہونے کی تمنا پیدا کریں۔ پس حکومتِ وقت نے نہایت چابکدستی کے ساتھ علمائے یہود کو آلۂ کار بنایا، اور ان کی مدد سے "حکومت کے باغی" کو کانٹوں کا تاج پہنا کر اپنی راہ سے ہٹا دیا۔

جب حکومت کو جناب مسیحؑ کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو اس نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ اصلی انجیل کو جو آرامی یا عبرانی زبان میں تھی اور جس میں یقیناً غیر اللہ کی غلامی سے نکلنے کی تاکید ہو گی، رفتہ رفتہ صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے نابود کر دیا، اور اس کی جگہ مختلف شہروں میں مختلف "انجیلیں" پیدا کر دیں۔ جن کی تعلیمات مذہبی حکومت کے منشاء کے مطابق تھیں۔ کلیسا کے مورخین نے اپنی کتابوں میں تقریباً ۱۵۰ انجیلوں کا ذکر کیا ہے جو یہود میں تشتت اور افتراق پیدا کرنے کے لئے، حکومت کے ایما سے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں نے مرتب کیں۔ جب قسطنطین سریر آرائے حکومت ہوا تو صلیب پرستوں کو عروج حاصل ہوا اور انہوں نے اپنی منشاء کے مطابق چار انجیلیں اور شاگردوں کے خطوط منتخب کر کے "عہد جدید" مرتب کر دیا جو آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ جس کا قدیم ترین نسخہ یونانی زبان میں پانچویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس سے پہلے کا حال پردۂ خفا میں مستور ہے لیکن اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ جناب مسیح

نے اگر کوئی کتاب اپنی قوم کو دی ہوگی تو وہ یونانی میں نہیں بلکہ عبرانی یا آرامی زبان میں ہوگی یہی وجہ ہے کہ مسیح کی انجیل کے اس رومن ایڈیشن میں آپ کو ایسی ایسی باتیں ملیں گی جو ہرگز ہرگز خدا کے کسی اولوالعزم نبی کے شایانِ شان نہیں ہیں مثلاً "قیصر کا حق قیصر کو دو" یا "میری بادشاہت اس دنیا کی نہیں ہے" وغیرہ وغیرہ یہود کو رومی قوم سے سخت نفرت تھی لیکن اس انجیل کے مطالعہ سے یہ بات قطعاً ظاہر نہیں ہوتی ۔ موجودہ انجیل کا مسیح تو رومی حکومت کا وفادار نظر آتا ہے ۔

الغرض، رومی حکومت نے اصلی مسیح اور اصلی انجیل دونوں کو یہود کی نظروں سے اوجھل کر کے ایک خود ساختہ مسیح اور خود پرداختہ انجیل قوم کو دی ۔ موجودہ انجیلوں کا مسیح تو ایک "صوفی مسیحا" نظر آتا ہے جو ترک دنیا پر اور تجرد اور غلامی پر قناعت کرنے پر زور دیتا ہے ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں رومی حکومت کے لئے مفید تھیں ۔

اب مرزا صاحب کو دیکھئے آپ نے بھی برطانی حکومت کی اطاعت کو جزو ایمان قرار دیا ہے، اور مسلمانوں کو برگِ حشیش پلانے کی سعی ناکام کی ہے ۔ جس طرح موجودہ انجیل کا پیش کردہ مسیح رومی حکومت کا مطیع نظر آتا ہے، اسی طرح موجودہ زمانہ کا "مثیل مسیح" برطانی حکومت کا مطیع نظر آتا ہے ۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مرزا صاحب، مثیل مسیح تو ہیں مگر نقلی مسیح کے مثیل ہیں، جس کا ذکر نہ قرآن مجید میں ہے نہ احادیث میں ۔

واضح ہو کہ مرزا صاحب نے ایک مرتبہ ضلع گورداسپور کے ایسے افراد کی فہرست مرتب کی تھی جو ان کی نظر میں "وفادار" نہ تھے اور حکومت کو ان کے متعلق معلومات بہم پہونچائیں تھیں، مرزائیوں نے اکثر اوقات اپنے مرشد کی اس تعلیم پر عمل کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی ممالک میں احمدیت کے ان مبلغین کو "برطانی جاسوس" سمجھا جاتا ہے، غالباً اسی اصولِ جاسوسی کے ماتحت مدیر سن رائیز نے بھی، حکومت کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال مسلمانوں کو درسِ حریت دے رہے ہیں اور ممکن ہے کہ ان کے پیغام کو پڑھ کر مسلمانانِ ہند ان کے ہم خیال ہو جائیں ۔

مدیر مذکور کو معلوم ہونا چاہئے کہ علامہ موصوف، خدا کے فضل و کرم سے، مرزائیوں کے اس فعل کو پرکاہ کی برابر بھی وقعت نہیں دیتے انہیں اس کی مطلق پرواہ نہیں اگر حکومت کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ مسلمانوں کو بیدار کر رہے ہیں یقیناً مسلمانوں کو بیدار کہنا کوئی جرم نہیں ہے ۔ شاید مرزائیوں کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ مسلمانوں کو بیدار کرنا ہی علامہ موصوف کی زندگی کا واحد مقصد ہے" ولو کرہ الکافرون "

بیشک علامہ موصوف اسلامی ممالک پر دولِ مغرب کے تسلط و اقتدار کو ناپسند کرتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی مسلمان جس کے دل میں اسلام کی محبت ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اسلامی ممالک، استعمار پرستانِ مغرب کی ہوس پرستی کا شکار ہو جائیں۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ بہت سے مسلمان ارکان اسمبلی کے وفد نے جو والسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ صاف لفظوں میں حکومت کو بتا دیا کہ مسلمانانِ ہند، حکومت برطانیہ کی اُس حکمت عملی کو جو فلسطین کے متعلق کارفرما ہے، سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ خود حکومت برطانیہ بھی اس حقیقت سے آگاہ ہو چکی ہے کہ مسلمانانِ عالم، اس کی استعماری پالیسی سے سخت بیزار ہو چکے ہیں، چنانچہ انگلستان کے بعض مدبرین اور امرائے سلطنت جن کے ناموں سے دنیا واقف ہے مسلمانوں سے دوستی پیدا کرنے کے لئے ایک انجمن بھی قائم کر چکے ہیں اور حکومت کو بہت سے سیاسی مبصر اکثر متنبہ کرتے رہے ہیں کہ اسے مسلمانوں کے جذبات کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہئے۔ لہٰذا مدیر سن رائیز کو مطمئن رہنا چاہئے کہ علامہ موصوف یا مسلمانانِ ہند پر اُن کی اس گیدڑ بھبکیوں کا مطلق کوئی اثر مرتب نہ ہوگا۔

تبصرہ نگار نے اس ریویو میں یہ بھی لکھا ہے کہ اقبال کے کلام میں "شعریت" نہیں ہے۔ ہمیں یہ الفاظ پڑھ کر مطلق تعجب نہیں ہوا کیونکہ فکر ہر کس بقدر ہمتِ اوست والا مضمون ہے۔ جو لوگ مرزا صاحب کو سلطان القلم کہتے ہیں اور "درثمین" کے اشعار کو مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ وہ بالِ جبریل یا ضرب کلیم کے اشعار کی قدر و منزلت کس طرح کر سکتے ہیں؟

مدیر مذکور کا یہ کہنا کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں تلخی پائی جاتی ہے سو اس کے متعلق گذارش ہے کہ تلخی اور تلخ کامی جو ناکامی کا نتیجہ ہے وہ تو کچھ قادیان ہی کے حصے میں آئی ہے۔ پرانی باتوں کو جانے دیجئے "سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح" اور سیدنا حضرت امیر قوم کے خطبات و ارشادات ہی کو دیکھ لیجئے جو ہر ہفتے۔ الفضل اور پیغام صلح میں شائع ہوتے ہیں اور جن میں ایک، دوسرے کے خلاف کیا کیا زہر اگلا جاتا ہے۔ کیا مدیر سن رائیز چاہتے ہیں کہ ہم انہیں اُن بدذات فرقہ مولویان اور ذریۃ البغایا جیسی نادر ترکیبیں از سر نو یاد دلائیں؟

اس بات کا تو دشمنوں کو بھی اعتراف ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں بشارت ہے بشاشت ہے، امید ہے جوش ہے، پاکیزگی ہے مسرت ہے مختصر یہ کہ نوید حیات ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اگر احمدیت کو بے نقاب کیا ہے، تو اسلئے

نہیں کہ وہ اسے اسلام کی سیاسی طاقت کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں بلکہ وہ اسے اسلام کی وحدت کے لئے ضرر رساں خیال فرماتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا صاحب نے بھولے بھالے مسلمانوں کو، اسلام کے لباس میں جلوہ گر ہو کر، راہِ راست سے ورغلایا، انہوں نے یہ کہہ کر ناواقف مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کی کہ میں کسرِ صلیب کے لئے مبعوث ہوا ہوں حالانکہ وہ خود مدۃ العمر صلیب پرستوں سے دادِ وفاداری طلب کرتے رہے اور اس مطلب کے چند الہام بھی شائع کئے مگر افسوس کہ کچھ قدر دانی نہ ہوئی۔ صلیب کی مخالفت مگر صلیبی قوتوں کی حمایت کیسا عجیب فلسفہ ہے۔ گلگلے کھانا مگر تیل سے پرہیز کرنا غالباً ایسے ہی موقعوں کے لئے کہا گیا ہوگا۔ اگر انہیں یورپین تاریخ سے واقفیت ہوتی تو شاید اس قسم کا دعویٰ کرنے کی زحمت گوارا نہ فرماتے کیونکہ ظاہری اور معنوی دونوں پہلوؤں سے یہ کام خود یورپ ہی نے مرزا صاحب کی پیدائش سے پہلے سرانجام دیدیا تھا۔

معنوی رنگ میں کسرِ صلیب کا دور اٹھارہویں صدی میں شروع ہوا جب خود عقلائے یورپ نے ریفارمیشن کے بعد مسیحیت کے خلافِ عقل اور مشرکانہ عقائد کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ تثلیث۔ تجسم۔ کفارہ۔ ہبوطِ آدم۔ سرنوشت ازلی۔ معصومیت پوپ۔ استحالۂ جوہری۔ عشائے ربانی۔ الوہیت مسیح اور الہام انجیل سب کے پرخچے اڑا دیئے اور انیسویں صدی میں تو اسٹراوس نے یسوع کی شخصیت ہی کو افسانہ (Myth) ثابت کر دیا اور BAUR نے تنقید بائیبل کے اصول مدون کر کے، اس "الہامی مجموعہ" کو بالکل پایۂ اعتبار سے ساقط کر دیا۔ آج یورپ اور امریکہ میں فیصدی ایک تعلیمیافتہ انسان بھی ان عقائد پر ایمان نہیں رکھتا اور خود کلیسائی عہدہ داروں کو اس تلخ حقیقت کا اعتراف ہے۔

ظاہری رنگ میں کسرِ صلیب کا نظارہ خود بیسویں صدی میں ہماری آنکھوں نے دیکھ لیا۔ جبکہ بالشویکوں نے مسیحیت کو تیکبینی و دوگوش اور اس کے ساتھ ہی مذہب کو بھی اپنے ملک سے خارج کر دیا۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلاطین لا کلیسا لا الٰہ

الغرض کسرِ صلیب تو جس حد تک کی، یورپ نے کی، ہمارے مرزا صاحب نے کیا کیا؟ ہماری دانست میں انہوں نے اگر کچھ کیا تو یہ کہ مسلمانوں کو جناب مسیح کی قبر کا پتہ بتا دیا۔ حالانکہ وہ قبر جناب مسیح کی نہیں بلکہ یوز آسف کی ہے جو بدھ مذہب کا ایک سرگرم مبلغ تھا۔ مرزا صاحب نے یوز کو یک جنس قلم یوز بنا دیا اور یوز کا

سلسلہ یسوع سے ملا دیا ۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم پر غلامی مسلط ہوجاتی ہے تو اس کے افراد کی زندگی کے ہر شعبہ میں کاہلی، تن آسانی، اور بزدلی پیدا ہوجاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے اور اس کی مشکلات کا مقابلہ کرنے سے گریز کرتی ہے۔ چنانچہ آپ مسلمانوں کے گزشتہ تین چار سو سالوں کے آرٹ، لٹریچر، مذہب اور تصوف کا مطالعہ کر لیجئے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا ہوجائیگی ۔

ہندی مسلمانوں کو شاعری وہ پسند آتی ہے جس میں خلافِ عقل باتیں بیان کی گئی ہوں جن کو حقیقت اور واقعیت سے کوئی سروکار نہ ہو، اگر کوئی اللہ کا بندہ اپنی شاعری میں حقائقِ کائنات بیان کرتا ہے یا انہیں حقائقِ زندگی کی طرف بلاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ شاعری تو نثر کی طرح روکھی پھیکی ہے۔ شاعری ہی نہیں ہے ۔

تصوف اور مذہب کی وہ تاویل پسند آتی ہے جو ان کے لئے ترکِ دنیا، اور تن آسانی کا جواز پیدا کر سکے، اور مسیح موعود اور مہدیؑ معہود کے ظہور کے انتظار میں زندگی بسر کرنے کا موقع دے سکے ۔

تحریک احمدیت، اسلامیانِ ہند کی اس غیر اسلامی ذہنیت کی پیداوار اور ان کے انحطاط پر ایک روشن شہادت ہے، یہ اُن کے زوال کی جیتی جاگتی تصویر ہے جو آج ہمیں نظر آرہی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اس تحریک کا تمام تر خلاصہ

ہ؎ اب رہا مرزا صاحب کا یہ فرمانا

چوں مرا نورے پئے قوم مسیحی دادہ اند   مصلحت را ابن مریم نام من بنہادہ اند

یعنی آپ نے اپنے نزول کا دوسرا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ، آپ کی تعلیم سے مسیحی لوگ اسلام کی طرف مائل ہوجائیں گے اور ہندوستان میں "یدخلون فی الدین اللہ" کا نظارہ دوبارہ دیکھنے میں آئیگا، تو اس کے متعلق عرض ہے کہ عیسائیوں کی تعداد میں کمی ہونے کے بجائے

رات دن اضافہ ہی ہو رہا ہے، دور جانے کی ضرورت نہیں مرزا صاحب کے ضلع گورداسپور میں، گزشتہ ۴۵ سال میں، عیسائیوں کی مردم شماری میں جو اضافہ ہوا ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ چونکہ انہوں نے ۱۸۹۱ء میں ماموریت اور مجدد ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس لئے اسی سنہ سے شروع کرتے ہیں ۔

سنہ ۱۸۹۱ء میں عیسائیوں کی تعداد ۲۴۰۰ تھی ۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں جب آپ نے نبی ہونے کا اعلان کیا اور ایک غلطی کا ازالہ شائع فرمایا تو ان کی تعداد ۲۴۴۷۱ ہوگئی ۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں یعنی آپ کی نبوت کے زمانہ میں ان کی تعداد ایک دم ۲۳۳۶۵ ہوگئی ۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں غالباً فیضانِ نبوت کی بدولت ۳۲۸۳۲ اور سنہ ۱۹۳۱ء میں ۴۳۲۲۷ ہوگئی

اور مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے سے گریز کیا جائے اور اغیار کی غلامی کو موجب رحمت سمجھا جائے۔

اس خاص قسم کی نبوت کی غرض و غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کو بھنگ حشیش کے جام پلائے جائیں اور ان کو ایسی خواب آور گولیاں، مذہب کے ورق میں لپیٹ لپیٹ کر کھلائی جائیں کہ وہ اپنی ذلت اور نکبت، محکومی اور غلامی، پستی اور خواری کسی چیز کا احساس ہی نہ کر سکیں۔

اگر میرا یہ قول باور نہ ہو تو تحریک احمدیت کا مطالعہ کر کے دیکھ لیجئے سوال یہ ہے کہ اس تحریک نے مسلمانوں کو اپنی حالت کے سنوارنے کا، اپنی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مشکلات کے دور کرنے کا اور دنیا میں عزت اور شرافت کی زندگی بسر کرنے کا کیا طریقہ سکھایا ہے؟

اگر آپ مرزا صاحب کی تعلیمات کے ساتھ علامہ اقبال کے کلام اور ان کے روح افروز پیغام کا مقابلہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ دنیائے اسلام کے اس عدیم المثال شاعر کے سامنے، سرزمین پنجاب کا یہ "نبی" ادعائے وحی والہام اور پچاس الماری کتابوں اور لایعنی پیشگوئیوں کے باوجود، کوئی حقیقت نہیں رکھتا، ان دونوں میں موازنہ چہ معنی دارد، دور کی بھی نسبت نہیں ہے، ایک اپنی قوم کو آزادی اور سربلندی کا درس دے رہا ہے دوسرا اسے غلامی اور رسوائی کے قعر مذلت کی طرف لے جا رہا ہے"۔

آج مسلمانوں کے لئے جو مسائل، موت و زیست کا حکم رکھتے ہیں وہ یہ نہیں کہ مسیح مر گئے یا زندہ ہیں؟ اور مرزا غلام احمد قادیانی مثیل مسیح ہیں یا نہیں؟ بلکہ یہ کہ غلامی کی زنجیریں کیونکر کٹیں؟ اور استعمار پرستان مغرب کے چنگل سے رہائی کیونکر نصیب ہو؟ جو نبی اس غلامی کو رحمت قرار دیتا ہو، اس کی تعلیمات میں مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کا حل تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے "چیل کے گھونسلا میں ماس" تلاش کرنا۔

یہ پیشگوئی کہ تین سو سال کے بعد تمام دنیا احمدی ہو جائیگی، مسلمانوں کے موجودہ مصائب کا خاتمہ نہیں کر سکتی

(*) اس جگہ اس امر کی صراحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علامہ موصوف نے مخاطبہ و مکالمہ الٰہیہ کا کبھی دعویٰ نہیں کیا اور نہ انہوں نے یہ کہا کہ مجھے الہام ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرتے ہیں اور ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہوگی کہ وہ کس قدر صداقت، صفائی، خلوص اور دیانت داری کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرتے ہیں اور جس چیز کو وہ حق سمجھتے ہیں اسے لگی لپٹی رکھے بغیر، علانیہ صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔

پس میں تمام احمدیوں کو مخلصانہ طور پر نصیحت کرتا ہوں کہ اگر وہ، اسلام کے دوست ہیں، جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں، تو برائے خدا، پنجاب کے بھولے بھالے مسلمانوں کی حالت پر رحم فرمائیں اور انہیں غلامی کا سبق پڑھانے سے باز آجائیں"

مسلمان بہت دنوں تک خوابِ غفلت میں سوتے رہے اور دشمنوں کو دوست سمجھتے رہے اب وقت آگیا ہے کہ اقبال کے کلام میں حیاتِ تازہ کا سامان تلاش کریں۔ اقبال شاعر نہیں ہے بلکہ "مسیحا" ہے، اس کا کلام مردہ دلوں کو زندگی بخشتا ہے اور اس کا پیغام، فی الحقیقت اسلام ہی کا پیغام ہے۔ اسی لئے وہ کہتا ہے

ازربّ ُو تا بم نصیب خود بگیر
بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

مولینا عبدالماجد دریابادی مدظلہٗ میدانِ صحافت میں

آپ کا ذاتی اخبار

سچ کی بجائے "صدق"

یکم مئی ۱۹۳۵ء سے ۱۷×۲۷ ۲۰ پونڈ سفید چکنے کاغذ پر ہر مہینہ کی یکم - گیارہ اور اکیس کو شائع ہوتا ہے ہمکو معلوم ہے کہ وہ صاحب ذوق حضرات جو مولینا عبدالماجد دریابادی کے طرزِ انشا کے عاشق ہیں اور آپکے مخصوص دلنشیں طرزِ صحافت کیلئے آپکے اخبار سچ کے بند ہونیکے بعد سے بیتاب تھے اس مژدہ کو صحیح معنوں میں مژدہ سمجھیں گے لیکن چونکہ ہمارے پاس اخبار سچ کے خریداروں کی مکمل فہرست موجود نہیں ہے اس وجہ سے ہم فرداً فرداً خریداران سچ کو نمونہ روانہ نہ کرسکے۔ لہٰذا شائقین حضرات اپنا اپنا چندہ قیمتی چار روپیہ جلد از جلد روانہ فرماکر خریداران کے رجسٹر میں اپنا نام درج کرالیں ورنہ بعد کو پچھلے پرچے دستیاب نہ ہونے پر پچھتانا پڑے گا۔ "صدق" ہر اعتبار سے "سچ" سے بڑھا ہوا ہے معنوی حیثیت سے معنٰی قرآنی کا اضافہ۔ سالانہ چندہ للعہ ـ ترسیل زر بنام منیجر اخبار "صدق" ۴۳ امین آباد پارک لکھنؤ۔

جامعہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر محمد عاقل ایم اے

یہ جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے۔ جو تقریباً ۱۰ سال سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ اور اپنے بلند پایہ علمی مضامین کے باعث ملک میں نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ رسالے کی سالانہ قیمت پانچ روپے ہے۔ نمونے کا پرچہ ایک آنہ کا ٹکٹ بھیج کر طلب فرمایئے

رسالہ جامعہ۔ قرول باغ۔ نئی دہلی

دہلی عہدِ اکبر شاہ میں

شیخ محمد اکرام، آئی۔سی۔ایس۔ سورت

طلوع اسلام کے دیرینہ کرمفرما جناب شیخ محمد اکرام صاحب آئی۔سی۔ایس سورت نے حال ہی میں غالب نامہ کے نام سے ایک مفصل کتاب مرزا غالب مرحوم کے سوانح زندگی اور شاعری پر تصنیف کی ہے جس کے ایک باب کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں۔ شیخ صاحب کی اس تصنیف میں مرکزی شخصیت اگرچہ مرزا غالب رح کی ہے، لیکن اس سلسلے میں انہوں نے دہلی کے علم و ہنر پر ضمناً جو روشنی ڈالی ہے وہ قارئین طلوع اسلام کے لئے غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہوگی ——— مدیر

مرزا کا دہلی میں آنا جانا اسی وقت سے شروع ہوا جب شاہ عالم ثانی جنہیں غلام قادر روہیلا نے آنکھیں نکال کر اندھا کر دیا تھا تخت شاہی پر متمکن تھے۔ روہیلوں کی بغاوت کے بعد دہلی میں مرہٹوں کا اقتدار بڑھا تو سندھیا نے انہیں قید خانے سے نکال کر قلعہ میں بادشاہی تخت پر بٹھا دیا۔ اور اس کے بعد جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے سندھیا کو شکست دی اور دہلی میں انگریزی نظم و نسق قائم ہوا تو شاہ عالم ثانی کو بدستور تخت نشین رہنے دیا گیا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ انکی حالت پہلے سے بہتر ہوگئی۔ مسٹر آرچیبالڈ سیٹن ریزیڈنٹ دہلی، بادشاہ کے جذبات کا ہر بات میں خیال رکھتے اور قلعہ اور شہر میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جاتی، بادشاہ کی جو خاصہ کی جاگیریں تھیں انکی آمدنی بڑھ گئی تھی۔ اسکے علاوہ اس زمانہ میں سکوں پر بادشاہ کا ہی نام ہوتا تھا۔ اور جاگیرداروں اور رئیسوں کی وراثت پر بادشاہ کی مہر توثیق کو ہی سب

سے زیادہ اہمیت دی جاتی۔ شاہ عالم کی وفات ۱۸۰۶ء میں ہوئی اور انکی بجائے شاہ اکبر ثانی جانشین ہوئے۔ انکے زمانہ میں مسٹر آرچیبالڈ سیٹن کی پالیسی قائم نہ رکھی گئی، لیکن قلعہ میں پھر بھی کوئی مداخلت نہ ہوئی اور شہر میں بھی شاہی جلوس اور سواری کا اہتمام اسی شان سے جاری رہا جو اس سے پہلے تھا۔ علاوہ ازیں اگرچہ بادشاہ کی ہستی شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ وہ اپنے موروثی حقوق پر اڑے رہے چنانچہ ۱۸۱۴ء میں جب گورنر جنرل کلکتہ سے دہلی آئے تو انکی ملاقات بادشاہ سے اسی وجہ سے نہ ہوسکی کہ بادشاہ نے ان کو اپنے برابر کرسی دینا قبول نہ کیا۔

قلعہ سے قطع نظر اس وقت شہر دہلی کی حالت موجودہ زمانہ سے بہت مختلف تھی۔ شہر کے گرداگرد فصیل تھی اور سارا شہر اسکے اندر آباد تھا۔ شہر کے دروازے شام کو بند ہوتے اور صبح کو کھول دئے جاتے۔ جہاں شہر دہلی کا موجودہ سٹیشن ہے وہاں اس زمانے میں مکانات تھے اور جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان جو اب وسیع میدان ہے۔ غدر سے پہلے ایک آباد محلہ تھا۔ جہاں امرا و اراکین سلطنت رہتے تھے۔ چاندنی چوک کے درمیان اس زمانے میں نہر بہتی تھی جس کے دونوں طرف خوشنما سایہ دار درخت تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جبتک دہلی میں مرہٹوں کا راج رہا شہر اور شہر کا قرب و جوار لٹیروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ نہیں تھا۔ جہاں جان و مال خطرے میں ہو۔ وہاں قدرتی امر ہے کہ علم و فن عروج نہ پائے چنانچہ دہلی میں جو کوئی شعر و سخن یا کسی اور فن میں نام پیدا کرتا۔ اسے لکھنؤ کی کشش یہاں سے کھینچ لے جاتی۔ لیکن جب ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کا نظم و نسق قائم ہوا تو نہ تو صرف شہر کی آبادی و خوشحالی بہت بڑھ گئی۔ بلکہ علم و فن کا جو شیرازہ بکھرا ہوا تھا وہ پھر ایک دفعہ بندھ گیا۔ اور بقول حالی ۔ "دارالخلافہ دہلی میں چند ایسے اہل کمال جمع ہو گئے۔ جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری اور شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتے تھے" سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں اس زمانے کے اکابر علماء اور شعرا کے حالات لکھے ہیں۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسری ممتاز ہستیوں سے قطع نظر اس زمانہ کے شعرا میں شاہ نصیر، ذوق، مومن۔ علماء میں شاہ عبدالعزیز شاہ اسمٰعیل۔ شاہ عبدالقادر۔ حضرت سید احمد بریلوی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی اطباء میں

حکیم محمود خاں۔ حکیم احسن اللہ خاں۔ حکیم رضا خاں۔ اور نقادوں میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ موجود تھے اور یہ وہی لوگ ہیں۔ جن کے زیر اثر سرسید۔ حالی۔ نذیر احمد۔ آزاد۔ ذکاء اللہ۔ داغ کی تربیت ہوئی۔ جو اگرچہ خود پرانے نظام کے پروردہ تھے۔ لیکن بیس سال کے عرصے میں شمالی ہندوستان کو ایک نیا نظام تعلیم۔ نیا لٹریچر۔ اور مذہب کی مدافعت کے لئے نئے ہتھیار دے گئے تو ہمیں غالب کے اس ماحول کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ جس کا وہ ایک جزو تھا۔ اور جس کی ناواقفیت کی وجہ سے عوام کے نزدیک غالب کی شخصیت ایک معمہ بن کر رہ گئی۔

حالی اُس زمانے میں دہلی آئے۔ جب یہاں پت جھڑ شروع ہوگئی تھی لیکن ابھی باغ میں پھول اور پھولوں کے گرد بلبلیں موجود تھیں۔ چنانچہ انہوں نے حکیم محمود خاں کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں اس زمانے کی نہایت موثر تصویر کھینچی ہے ؎

اے جہان آباد اے اسلام کے دارالعلوم — اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنر ور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم — تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم

زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہان آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاق علم دین — جیسے امی تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں
ہند میں تھا جو محدث تھا وہ تیرا خوشہ چیں — تھی محدث خیز اے پایتخت تیری سرزمیں

تھا تفقہ بھی مسلم تیری خاک پاک کا
بیہقی وقت تھا ہر اک فقیہ اس خاک کا

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم — آن کر اُس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغ ارم — بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم

ہند میں جاری تجھی سے طب یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی

لے کے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم — جن میں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم

دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم　　کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے انکے جھوم جھوم

آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصل خزاں

تیری سرحد میں رہا ہے علم و دانش کا سماں

در آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا　　بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تو نے سنبھالا سا لیا

خاک نے یاں پھر تیری اگلے وہ لعل بے بہا　　جن سے روشن ہو گیا کچھ دن کو نام اسلاف کا

عہد ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا

خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و منعت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی　　پر نہ کی عرض ہنر میں تو نے اب بھی کوتہی

اس بزرگی سے گذاری تیرھویں تو نے صدی　　پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دور اکبری

علم دین و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم

ڈال دی پھر تو نے اپنی چار سو ہر فن میں دھوم

حیات ثانی۔ جن لوگوں نے انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک کی ذہنی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ ریفارمیشن Reformation یعنی اصلاح مذہب اور رینائے سنس کی دو تحریکوں سے واقف ہونگے۔ جنہوں نے سولھویں صدی میں وہاں نئی روح پھونک دی تھی۔ اور علمی اور مذہبی نقطۂ نظر سے ایک نئے دور کا آغاز کیا تھا۔ مرزا جس وقت دہلی آئے۔ تو یہاں بھی وہی حالات رونما تھے جنہوں نے دو صدیاں پہلے یورپ کی کایا پلٹ دی تھی۔ انگلستان میں چھاپہ خانہ کی ابتداء سولھویں صدی میں ہوئی۔ اور اس کے قائم ہونے کے بعد ہی علم صحیح معنوں میں عام ہونا شروع ہوا۔ دہلی میں چھاپہ کے آغاز کا قریب قریب یہی زمانہ تھا۔ اور یہاں بھی اس سے اشاعت علم کو وہی فائدہ پہنچ رہا تھا۔ جو انگلستان میں ہوا۔ رینائسنس کا ایک اہم واقعہ بائیبل کا انگریزی ترجمہ ہے جس کی ابتدا میں بیحد مخالفت ہوئی۔ اور جس کی وجہ سے ویکف اور اس کے ساتھیوں کو سخت ایذا نہیں پہنچائی گئیں۔ ہندوستان میں بھی قرآن مجید کا پہلا فارسی ترجمہ کرنے پر شاہ ولی اللہ کو سخت تلواروں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان کی جرأت اور قابلیت سے

۱۷۳۷ء میں ہی ہندوستان میں وہ مرحلہ طے ہوگیا۔ جس کے لئے ترکی کو دو صدیاں انتظار کرنا پڑا۔ لیکن جس طرح مغربی "رینائے سنس" کی ایک اہم خصوصیت عام ملکی زبانوں کی ابتدا تھی۔ ہندوستان میں بھی فارسی اور عربی کی جگہ اردو لے رہی تھی۔ اور چونکہ علما زمانے کی رفتار پہچانتے تھے۔ اردو نثر کی سب سے پہلی کتابوں میں قرآن مجید کا اردو ترجمہ تھا۔ جسے شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے ۱۸۰۳ء میں دہلی سے شائع کیا +

علاوہ ازیں جس طرح مغربی "رینائے سنس" کی ایک اور قابل ذکر بات درس و تدریس کا بلند معیار تھا۔ دہلی بھی اس زمانے میں اپنے معلموں اور مدرسوں کی وجہ سے شہرۂ آفاق تھی، بالخصوص شاہ عبدالعزیزؒ کی ذات والا صفات کی موجودگی وجہ سے جو اپنی سلامت روی۔ صحیح قوت فیصلہ اور علمی قابلیت کی وجہ سے مغربی "رینائے سنس" کی ایک قابل احترام ہستی ایراسمس سے بہت مشابہ ہیں اور جن کے درس کے لئے کشمیر۔ افغانستان۔ اور بلخ بخارا سے طلبہ کھچے آتے تھے اُن کے علمی تبحر اور انصاف پسندی کے آگے سب سر جھکاتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نہ صرف وہ علم و فضل میں بے نظیر تھے۔ بلکہ زمانے کی نبض بھی خوب پہچانتے تھے۔ چنانچہ جب سرکار انگریزی نے دہلی کالج قائم کیا۔ اور لوگ وہاں اولاد بھیجنے کے متعلق متامل تھے۔ تو شاہ صاحب نے بڑے زور سے وہاں تعلیم حاصل کرنے کی حمایت کی۔ اور علیگڈھ کالج قائم ہونے سے کوئی پچاس سال پہلے مغربی اور سرکاری درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے حق میں فتوے دیا +

جنرل سلیمن نے جو ٹھگی کے انسداد کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور جنہیں ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے جلنے کا اتفاق عام یورپین افسروں سے زیادہ ہوتا رہا ہے اس زمانے کی تعلیمی حالت کے متعلق لکھتے ہیں:" دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہونگی۔ جن میں تعلیم اس قدر عام ہے۔ جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ ان میں جو کوئی بیس روپیہ ماہوار کا متصدی ہوتا ہے وہ اپنے لڑکوں کو اسی طرح تعلیم دیتا ہے جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو۔ اور جو علوم ہمارے بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں

اپنے کالجوں میں حاصل کرتے ہیں۔ وہی یہ لوگ عربی اور فارسی زبانوں میں سیکھتے ہیں! اور سات سال کے درس کے بعد ایک طالب علم اپنے سر پر جو آکسفورڈ کے پاس شدہ طالب علم کی طرح علم سے بھرا ہوتا ہے دستارِ فضیلت باندھتا ہے۔ اور اسی طرح روانی سے سقراط۔ ارسطو۔ افلاطون بقراط جالینوس اور بوعلی سینا کی نسبت گفتگو کر سکتا ہے۔ جس طرح آکسفورڈ کا پاس شدہ طالب علم جنرل سلیمن نے ایک اور جگہ لکھا ہے "ایک تعلیم یافتہ مسلمان فلسفہ، ادبیات اور دوسرے علوم وفنون پر قابلیت سے گفتگو کر سکتا ہے اور بالعموم ان مضامین پر گفتگو کرنے اور موجودہ زمانے میں ان میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ انہیں سمجھنے کا بہت خواہشمند ہوتا ہے"

اِن سطور سے یہ تو واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان کا نظامِ تعلیم اس زمانے کے انگریزی نظامِ تعلیم سے یا آکسفورڈ کے موجودہ کلاسیکل کورس کے مقبول عام نصاب سے کسی طرح پست نہیں تھا اور اس کے علاوہ اگر درخت فقط اپنے پھل سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اور درس وتدریس کے حسن وقبح کا اندازہ طالب علموں کی کامیابی اور قابلیت سے ہی لگایا جا سکتا ہے تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں جن معلموں کے حلقۂ درس سے سرسید، حالی، آزاد، داغ، شیفتہ (اور غالب!) دستارِ فضیلت باندھ کر نکلیں وہ اپنے درس وتدریس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے +

اس عام علمی اور ادبی چہل پہل کے علاوہ ایک تحریک جس سے اس وقت دہلی کے گلی کوچے گونج رہے تھے۔ سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی تحریک اصلاح تھی۔ جسے سرسید احمد نے لوتھر کی تحریک "ریفارمیشن" کے مشابہ قرار دیا ہے۔ اور حضرت بریلوی کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر کے اعتراضات کا جواب دیتے لکھا ہے کہ جس طرح لوتھر نے یورپ کے بڑے حصے کو پوپ کی غلامی سے نجات دلائی اسی طرح یہ تحریک بھی تقلید کی مخالفت میں تھی۔ اور سید احمد بریلوی نے ان فضول اور مضر رسموں کے خلاف جو ابتدائے زمانہ سے ہندوستانی معاشرتی زندگی کا جزو ہو گئی تھیں۔ کوشش کر کے نہ صرف مذہبی بلکہ معاشرتی نقطہ نظر سے بھی شمالی ہندوستان پر بڑا احسان کیا ہے۔ ہمیں اس تحریک کے متعلق مفصل بحث کی ضرورت نہیں لیکن غالب کا گرد وپیش سمجھنے کے لئے اس کا تذکرہ ضروری ہے۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب دہلی میں تمام اہل الرائے یا اس تحریک کے طرفدار تھے۔ یا مخالف۔

شاہ نصیر دہلوی نے جن کی خوش اعتقادی کی آزاد نے آب حیات میں کئی مضحکہ خیز مثالیں دی ہیں اس تحریک کے خلاف نظمیں لکھیں۔ برخلاف اس کے مشہور شاعر مومن مولانا سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ اور دیوان مومن کا آغاز مولانا کی تعریف سے ہوتا ہے۔ غیر مقلدین میں سب سے زیادہ رسائل شاہ اسمٰعیل اور سر سید احمد خاں نے لکھے۔ اور مقلدین کی ترجمانی مولوی فضل حق نے کی۔ جو قدیم علم پرور خیر آبادی خاندان کے رکن تھے۔ اور غالب کے نہایت عزیز دوست۔ مرزا نے بھی ان مباحثوں میں عملی حصہ لیا۔ اور عقائد وہابیہ کے خلاف ایک فارسی مثنوی لکھی لیکن جیسا کہ حالی نے یادگار غالب میں واضح کیا ہے۔ ان کا اپنا نقطہ نظر شاہ اسمٰعیل سے بہت ملتا تھا۔ اس مثنوی کے مطالب بہت اہم نہیں ہیں۔ اور اس سے بھی کہیں زیادہ اہم وہ ذہنی تطابق ہے۔ جو شاہ اسمٰعیل اور مرزا کے عام نقطۂ نظر میں تھا۔ شاہ صاحب کے مذہبی عقائد کیا ہوں لیکن آخر اُن کی تصنیفات کا اہم ترین پہلو تقلید کے خلاف جہاد تھا۔ بیشک وہ قرآن شریف اور مستند احادیث کے قائل تھے لیکن عوام جس کو اسلام سمجھتے تھے۔ وہ یا تو رسوم و عقائد کا وہ طومار تھا۔ جو مقامی اثرات سے اسلام کا جزو بن گیا تھا۔ یا آئمہ اربعہ کی کورانہ تقلید شاہ اسمٰعیل اس میں کسی کے بھی قائل نہ تھے۔ اور جب ہم شاہ صاحب کی تصنیفات پڑھتے ہیں۔ تو خیال ہوتا ہے کہ جس آزادی اور جرأت سے وہ رائے عامہ اور مسلمہ ہستیوں کی مخالفت کر رہے تھے اور جس بیباکی سے صدیوں کی معبودیت گرا رہے تھے۔ ناممکن ہے کہ اس کا اثر غالب پر نہ ہوا ہو۔ اور ان کی طبعی آزاد خیالی اور راسخ نہ ہو گئی ہو۔ شاہ صاحب اور مرزا کے خیالات کی راہیں مختلف تھیں۔ لیکن جس طرح اُنہوں نے شاہ صاحب کو مذہب یا رسوم و معاشرت میں تقلید کی مخالفت کرتے دیکھا۔ اسی طرح خود فن نعت اور فن شعر گوئی میں اُستادوں پر آزادانہ نکتہ چینی کی۔ اور جس طرح شاہ صاحب بڑے بڑے بزرگوں کے نام گنا کر کہتے تھے کہ آخر وہ انسان تھے۔ اور غلطی کر سکتے تھے۔ اسی انداز سے غالب نے بھی کہا۔ کہ اگلے جو کچھ کہہ گئے۔ وہ سب سچ نہیں۔ اور ہر پرانی لکیر صراط مستقیم نہیں ہوتی +

ان دونوں تحریکوں کا جو مرزا پر اثر ہوا ہوگا۔ وہ تو بیشتر ذہنی ہے۔ لیکن دہلی آنے سے جو اثر اُن کی شاعری پر ہوا۔ وہ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ آگرے میں شعراء اور شعر فہم حضرات کی وہ کثرت نہ تھی۔ جو دہلی میں تھی۔ اور غالب کے عجیب و غریب اشعار پر جب یہ لوگ معترض ہوتے۔ تو وہ انہیں

خاطر میں نہ لاتے۔ چنانچہ انہوں نے آگرہ میں ایک رُباعی لکھی تھی :-

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سُن سُن کے اسے مُلول ہوتے ہیں جاہل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

لیکن جب مرزا دہلی آئے۔ اور مولانا فضل حق اور دوسرے مسلّمہ اُستادوں نے انہیں ان اشعار کے حسن و قبح سے آگاہ کیا۔ تو مرزا کو ان کے علم و فضل کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اور جس طرح مندرجہ بالا رباعی کا دوسرا مصرعہ تبدیل کیا۔ اور اپنے معترضوں کو بجائے "جاہل" کے "سخنورانِ کامل" کہا۔

دہلی آنے کے بعد غالب کی شاعری میں جو نمایاں تبدیلی ہوئی۔ اس کی ایک اہم وجہ ہندوستان کے فارسی شعرا کا غائر مطالعہ اور ان کی تقلید ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مرزا کی شاعری کا صحیح اندازہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے۔ جب میر اور سودا کے بجائے نہیں بیدل اور عرفی کا جانشین سمجھا جائے۔ بے شک انہوں نے اُردو شعر لکھے لیکن انہوں نے کسی اُردو شاعر کی پیروی نہیں کی۔ بلکہ اُردو میں بھی پہلے بیدل اور بعد میں عرفی، نظیری کی طرز میں اشعار لکھے۔ وہ میر کے مداح تھے۔ لیکن میر کی غزلوں پر بھی جو غزلیں اُنہوں نے لکھی ہیں وہ میر نہیں بلکہ بیدل کے رنگ میں ہیں۔ اور اگرچہ ان کے اس زمانے کے اشعار کی زبان اُردو ہے۔ لیکن مضمون اور زبان کی تمام خصوصیات فارسی شاعری کی ہیں مرزا اپنے اُردو اور فارسی کلام میں وہ حد فاصل نہیں رکھتے تھے۔ جو اس زمانے میں عوام کی فارسی سے ناواقفیت سے ہوگئی ہے۔ وہ گل رعنا کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اُردو اشعار کے لکھنے میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا۔ جو فارسی اشعار کے لکھنے میں۔ اُن کی شاعری بقول اُن کے ایک باغ کی طرح ہے جس کے دو دروازے ہیں ایک اُردو اور ایک فارسی۔ اور مرزا کے مقابلہ میں باقی اُردو شعرا کے کلام کی پستی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان شعرا کی نظر دہلی سے پہلے نہیں جاتی تھی۔ اور ان کے کلام میں مضامین کی وہ شادابی اور تنوّع نہیں۔ جو مرزا کے کلام میں ہے۔ جن کی روایات کا سلسلہ حزیں۔ بیدل ظہوری عرفی، نظیری کے واسطے سے امیر خسرو تک پہنچتا ہے۔ مرزا نے آغاز بیدل کے رنگ میں کیا لیکن جب انہوں نے فارسی شاعری کا زیادہ مطالعہ کیا۔ اور شیخ علی حزیں نے مسکرا کر ان کی بے راہ روی اُنہیں جتائی۔ اور طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ تھا

فنا کر دیا۔ اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا سکھایا۔ تو ان کے کلام میں ان شعراء کی خصوصیات زیادہ آگئیں۔ اور وہ تشبیہوں کی غرابت اور پیچیدہ تراکیب کے اس سراب سے بچ نکلے جس میں بیدل کی شعریت فنا ہوئی تھی۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کے دوسرے حصہ میں دکھائیں گے۔ مرزا کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت انسانی فطرت کی واقفیت ہے۔ جو اردو کے اور شعراء میں نہیں لیکن آخر مرزا کا نفسیاتی تعمق اکبری شعراء کی وہی معاملہ بندی ہے۔ جو عرفی اور دوسرے شعراء میں تو محبت کے چند پہلوؤں تک محدود تھی لیکن جسے مرزا نے وسعت دے کر تمام انسانی فطرت کا مطالعہ بنا دیا ہے مرزا کو دہلی آنے سے پہلے ہی فارسی شاعری سے لگاؤ تھا لیکن فارسی کا کلام پڑھنے اور سمجھنے کا زیادہ موقعہ انہیں یہاں آنے کے بعد ہی ملا ہوگا! اور ہمارے خیال میں انکی شاعری پر خارجی اثرات میں سب سے اہم فارسی شعراء کا مطالعہ اور ان کی پیروی ہے

اس کے علاوہ مرزا کی شاعری میں جو انقلاب آیا۔ وہ بڑی حد تک اس انقلاب کا عکس تھا جو مرزا کی ذہنی گہرائیوں میں وقوع پذیر ہو رہا تھا! اس زمانے میں مرزا کی طبعی انفرادیت بہت کم ہو گئی تھی۔ عنفوانِ شباب میں انسان اپنے تئیں دنیا کا مرکز سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ میری رائے اور پسند کے آگے سب کو سر جھکانا پڑے گا۔ مرزا کی طبیعت میں یہ رجحان جیسا کہ ان کے خاص طرز شاعری (یا ان کے بھائی کی علالت سے بھی) خیال ہو سکتا ہے عوام سے بہت زیادہ تھا! اور اس انتہائی انفرادیت کے بقول ایڈلس دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں کہ یا تو انسان قناعت اور خودداری کو حد سے بڑھا کر اور اپنے سوا باقی سب کو جاہل اور ہوش سے عاری سمجھ کر سوسائٹی سے اس طرح بیگانہ ہو جائے۔ کہ سوسائٹی کے نزدیک وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور یا دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھتے ہوئے اپنی انفرادیت کو ان حدود میں رکھے کہ اپنا امتیازی رنگ بھی قائم رہے اور دوسروں کے نزدیک سڑی پن بھی نہ ہو۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی تھی۔ کہ مرزا کے طبعی رجحانات پر ان کی عقل غالب آئی۔ اور انہیں خوش قسمتی سے ایسے دوست میسر آئے۔ جن کی صحبت نے ان کی بیقاعدگیاں ہموار کر دیں۔ شخصی انفرادیت مٹانے اور مناسب حسِّ تناسب سکھانے کے لئے سوسائٹی کا سب سے بڑا حربہ ظرافت ہے جسے کنجِ تنہائی سے بزمِ احباب زیادہ راس آتی ہے اور جوں جوں مرزا کا حلقہ احباب وسیع ہوتا گیا۔ اور ساتھ ساتھ مشاہدے اور تجربے سے طبیعت کی زود حسی کم ہوئی۔ تو ان کی انفرادیت بھی خوشگوار حدود میں آتی گئی! اور عجیب و غریب خیالات اور طبیعت کی (یبوست) کی جگہ خوشگوار خیالات اور ظرافت نے لے لی

سیاحتِ اندلس

طلیطلہ

میں ۲۱ دسمبر کو طلیطلہ پہنچ گیا۔ یہ شہر بہت قدیمی ہے۔ بعض نے ازلی البناء لکھا ہے۔ بعض نے یہ لکھا ہے کہ عمالقہ نے بنایا تھا۔ (نفح الطیب جلد دوم۔ صفحہ ۶۷۳) ایک کتاب میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت ذوالقرنین بھی یہاں تشریف لائے تھے۔ عیسائی مؤلفین نے بھی شہر کی قدامت کے متعلق رنگ برنگ کی روایات بیان کی ہیں۔ چنانچہ بعض نے حضرت نوح کے زمانہ تک پہنچا دیا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ جب یہودی بخت نصر کے زمانہ میں بیت المقدس سے بھاگ کر آئے تھے تو انہوں نے طلیطلہ کو بسایا تھا۔ قصے صحیح ہوں یا جھوٹے لیکن شہر کی قدامت میں کوئی شک نہیں۔ قرطاجنہ والوں کے عملے دخلے کا تاریخ میں ذکر موجود ہے۔ پھر رومانوں کا یہاں دور دورہ رہا۔ اس زمانہ کے آثار شہر میں باقی ہیں۔ طلیطلہ کو سب سے زیادہ رونق قوطی بادشاہوں کے عہد میں ہوئی۔ جنہوں نے کم و بیش چار سو برس یہاں سلطنت کی اور (۲۷) بادشاہ تخت پر بیٹھے۔ آخری فرمانروا روریق تھا جس کو طارق نے ۷۱۲ء میں شکست دی تھی۔ قوطیوں کے شکست کے اسباب کے متعلق ایک نہایت دلچسپ قصہ نفح الطیب میں بیان کیا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ ہسپانیہ والوں کو عربوں اور بربروں کے حملے کا ہمیشہ سے ڈر تھا۔ چنانچہ کسی یونانی نے سلطنت کی حفاظت کے لئے ایک صندوق جادو کا بنایا۔ اور اس میں طلسم کو محفوظ کر کے اوپر سے قفل لگا دیا۔ پھر صندوق کو ایک حجرے میں بند کر دیا اور اس پر بھی قفل لگا دیا۔ حجرے کی حفاظت کا خاص اہتمام تھا اور ہر بادشاہ کے عہد میں ایک نیا قفل حجرے کے دروازہ پر لگ جاتا تھا۔ جب روریق بادشاہ ہوا تو حجرے پر چھبیس قفل پڑ چکے تھے۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ دیکھوں حجرے میں کیا ہے۔ وزیروں اور مشیروں سے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اس حجرے کو کھولوں۔ کیونکہ اس کے اندر کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ انہوں نے یہ عرض کیا کہ جہاں پناہ مصلحت یہی ہے کہ جیسے آپ کے بزرگ اسلاف کرتے چلے آئے ہیں ویسا ہی آپ کیجئے اور حجرے کو کھولنے کا ہرگز قصد نہ فرمائیے

اگر آپ کو زر و دولت کا خیال ہے تو جتنا اس حجرے میں آسکتا ہے اس سے کئی گنا آپ کے لئے جمع کر دیں گے
بادشاہ نے مشیروں کی ایک نہ سنی اور حجرے کو کھلوایا۔ جب سب قفل کھل چکے تو صندوق نظر آیا۔ اس کو
بھی کھلوایا۔ صندوق میں سے گول لپٹی ہوئی ایک جھلی اور سواروں کی مورتیں نکلیں۔ ان سواروں کے سر پر
عمامے بندھے ہوئے تھے اور عربی وضع کے گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور عربی تلواریں اور نیزے ہاتھ میں لئے
ہوئے تھے۔ بادشاہ نے مورتوں کو دیکھا اور پھر حکم دیا کہ جھلی کو کھولو اور پڑھو۔ جب پڑھنے والوں نے پڑھا
تو لکھا تھا کہ جس روز یہ حجرہ کھلا طلسم ٹوٹ جائیگا۔ اور وہ قوم جن کے پتلے صندوق میں رکھے ہوئے ہیں ہسپانیہ
کو فتح کر لیں گے۔ بادشاہ کو سن کر سخت افسوس ہوا۔ ابھی دربار جمع ہوا ہی تھا کہ ڈنکوں اور شہنائیوں کی
آوازیں آنے لگیں۔ ہرکارے خبر لانے کے لئے دوڑائے گئے۔ معلوم ہوا کہ عربوں کا لشکر چڑھ آیا ہے۔

جن لوگوں نے دہلی کے لوہے کی کیلی کی حکایت سنی ہے وہ اس قصہ کا ضرور لطف اٹھائیں گے۔ اس
فتح میں عربوں کے ہاتھ بے حد دولت آئی۔ ایک سو ستر تو فقط شاہی تاج تھے جو مورتیوں اور طرح بہ طرح
کے جواہرات سے مرصع تھے۔ ایک ایوان سونے اور چاندی کے برتنوں سے بھرا ہوا ملا۔ لیکن سب میں سے
بے مثل چیز جو ملی وہ خوانِ سلیمانی تھا۔ یہ زمرد کا بنا ہوا تھا۔ عیسائی اور مسلمان دونوں مذہبوں کے مورخین نے
اس خوان کے متعلق خوب بحثیں کی ہیں۔ جن میں گبن بھی شامل ہو گئے ہیں۔ نفح الطیب میں خوان کا چار پانچ جگہ
ذکر آیا ہے اور راست باز مولف نے بلا کم و کاست سب روایتوں کو بیان کر دیا ہے۔ اور یہ بھی لکھ دیا ہے
کہ اس خوان کے متعلق ایسے ایسے قصے سننے میں آئے ہیں کہ جن کا پڑھنے والے کو یقین نہیں آسکتا۔ سب روایتوں
میں ابن حیان کا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ان کا بیان ہے کہ اہلِ ہسپانیہ میں سے جب کوئی صاحبِ دولت مرجاتا تھا تو اس کا مال قیسوں اور راہبوں
کو ایصالِ ثواب کیلئے دے دیا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ کنیساؤں اور مذبح کی آرائش کے لئے انواع و اقسام کا
قیمتی اور جڑاؤ سامان بنواتے تھے۔ یہ خوانِ سلیمانی بھی اسی طرح سے بنا اور بہت سے بادشاہوں کے خزانے
اس کی ترصیع کاری میں صرف ہوئے۔ مذبح کی زینت کے لئے یہ خاص تہواروں کو نکالا جاتا تھا۔ اور عالم میں اس
کے زر و جواہر کی دھوم تھی۔ طارق کے ہاتھ جب یہ خوان لگ گیا تو موسیٰ کو جو ان کے عہدہ دارِ اعلےٰ تھے حسد ہوا
اور انہوں نے طارق سے یہ خوان لے لیا۔ لیکن طارق نے یہ چالاکی کی کہ خوان کا ایک پایہ اپنے پاس رکھ لیا۔

جب خلیفہ کے دربار میں موسیٰ پہنچے اور خوان کے متعلق ذکر ہوا تو طارق نے بادشاہ سے کہا کہ موسیٰ سے پوچھا جائے کہ اگر تم ہی اس کو لائے ہو تو اس کا پایہ جو ٹوٹا ہوا ہے وہ پیش کرو۔ موسیٰ اس سوال پر پریشان ہوئے تب طارق نے ٹوٹا ہوا پایہ پیش کیا۔ قدیم تاریخوں میں قصوں اور روایتوں کی بڑی کثرت ہے۔ ہمیں ان کے صدق و کذب سے غرض نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے طفیل ہم کو قوموں کے میلان اور رجحان اور نفسیاتی جذبات کا پتہ چل جاتا ہے۔

مسلمانوں کے زمانہ میں طلیطلہ کو خوب رونق ہوئی ۱۰۳۵ء تک تو یہ قرطبہ کے سلاطین کے ماتحت رہا۔ لیکن پھر پچاس برس بنی ذی النون نے یہاں خود مختارانہ سلطنت کی۔ مسلمانوں کا برتاؤ اپنی رعایا کے ساتھ نہایت ہمدردانہ رہا۔ ذات پات کا مطلق امتیاز نہ تھا۔ تمام عہد عیسائی مورخ اسلامی بے تعصبی کے شاہد ہیں۔ تجارت اور صنعت و حرفت کو بہت عروج ہوا۔ ریشم اور اون کے کام کے کارخانے قائم ہوئے اور اسلامی تمدن کی رنگ نے موسائی اور عیسائی سب کو یکساں رنگ دیا۔ یہودیوں کو بالخصوص اسلامی زمانہ میں بہت فروغ ہوا چنانچہ طلیطلہ اسرائیلی تہذیب کا مرکز بن گیا۔ ۱۰۸۵ء میں جب الفنش دالاذ فونش ششم نے بنی ذی النون کے آخری بادشاہ القادر باللہ کو شکست دی اور ملک پر عیسائی تسلط ہو گیا۔ تو کچھ عرصہ تک یہودیوں اور مسلمانوں کے ساتھ مذہب کی کچھ روک ٹوک نہیں ہوئی۔ لیکن پندرہویں صدی میں یہودی قلمرو سے نکال دیئے گئے۔ اور عربی زبانوں کے بولنے کی بھی ممانعت ہو گئی۔ گرجاؤں میں تب بھی نماز عربی میں ہوتی رہی۔ اس سے عربی زبان کے رواج کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ حکومت باوجود سیاسی اور مذہبی مغائرت کے عربی زبان کے استعمال کو نہ روک سکی۔

طلیطلہ کے اسلامی زمانہ کی عمارتیں سب مٹ چکیں۔ نفح الطیب میں ان کی صنعت اور خوبی کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ صفحہ ۳۴۷ جلد اول۔ صفحہ ۳۷ جلد دوم۔ بادشاہ نے اس محل کی تزئین میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تھا ایک مصنوعی جھیل بنائی تھی جس کے وسط میں ایک گنبد نما شہ نشین تھا۔ شاہ نشین کی چھت رنگ برنگ کے شیشوں سے آراستہ تھی۔ اور ان پر طلائی مینا کاری کی گئی تھی۔ حکمت سے پانی کو شہ نشین کی چھت پر پہنچایا تھا۔ اور وہاں سے چادریں چھٹتی تھیں۔ فانوسوں اور شمعوں کی روشنی رنگ برنگ کے شیشوں سے ملون ہو کر جب پانی کے چادروں کے پردے میں چھنتی تھی تو ایک عجیب پر لطف منظر پیدا ہو جاتا تھا۔ ایک روز المامون شہ نشین پر بیٹھا ہوا تھا۔ ساز بج رہے تھے اور ارباب نشاط ہالہ وار اس کو گھیرے ہوئے تھیں۔ اتنے میں

اس کے کان میں آواز آئی کہ کوئی یہ شعر پڑھ رہا ہے:

اتبنی بناء الخالدین و انما مقامك فیها لو علمت قلیل

لقد کان فی ظل الاراك کفایۃ لمن کل یوم یقتضیہ رحیل

ترجمہ - کیا تو ہمیشہ کے لئے محلات بنا رہا ہے - اے کاش کہ تو جانتا کہ تیری زندگی بہت تھوڑی ہے ایسے شخص کو جس کے کوچ کا روز تقاضا کر رہا ہو۔ یہ زیب تھا کہ وہ پیلو کے درخت کے سایہ میں سستا لیتا۔

اس میں شک نہیں کہ اسلامی بربادی کا ایک بڑا سبب ان کا تعیش بھی تھا - اس محل کے علاوہ مقری (صفحہ ۴۲۶ - جلد اول) نے طلیطلہ کی دو پن گھڑیوں کا موجد عبدالرحمٰن نامی مہندس تھا - اس نے سنا تھا کہ ہندوستان میں کسی نے ایسی طلسمی گھڑی بنائی تھی کہ سورج کے طلوع اور غروب کا حال انگلی دعوئی)، کی گردش سے معلوم ہوتا تھا مسعودی نے بھی اس گھڑی کا ذکر کیا ہے - عبدالرحمٰن نے طلیطلہ میں دریا کے بیچ میں ایک مکان تعمیر کیا اور اس میں حکمت سے ایسی دو گھڑیاں بنائیں کہ جن میں چاند کے گھٹاؤ اور بڑھاؤ سے پانی کم اور زیادہ ہوتا تھا ہر گھڑی میں چودہ نشان تھے - چنانچہ رویت قمر سے ہر شب و روز میں ان گھڑیوں میں $\frac{1}{14}$ حصہ پر ہو جاتا تھا اور جب ماہ کامل ہوتا تھا تو گھڑیاں بھی لبریز ہو جاتی تھیں - اسی طرح جب پندرہویں شب سے چاند کا گھٹاؤ شروع ہوتا تھا - تو گھڑیوں کا پانی بھی بتدریج کم ہونا شروع ہو جاتا تھا - اور انتیسویں تاریخ کو چاند غائب ہونے پر پانی بھی غائب ہو جاتا تھا - ایک کمال یہ بھی رکھا تھا کہ جن دنوں میں گھڑیوں میں پانی بھرا ہوا ہوتا تھا اگر کوئی شخص ان میں سے نکال لیتا تو خود بخود وہ کمی فوراً پوری ہو جاتی تھی - اس طرح سے جن دنوں میں پانی کم ہوتا تھا اگر کوئی بھر دیتا تو وہ زاید پانی فوراً خارج ہو جاتا تھا - یہ گھڑیاں ۵۲۸ھ تک چلتی رہیں لیکن عیسائی حکومت کے زمانہ میں جب کسی مہندس نے ان کی حکمت کو سمجھنے کے لئے گھڑیوں کو اکھاڑا تو پھر دوبارہ نصب نہ ہو سکیں

پن گھڑیوں کا رواج بابل اور مصر میں بھی تھا - بعض یونانی رومانوی مؤلفین نے ایسی پن گھڑیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو ساعت الرمل سے مشابہ تھیں اور عدالتوں میں وکلاء کی بحثوں کے لئے استعمال کی جاتی تھیں - لیکن طلیطلہ کی گھڑیوں کی یہ خصوصیت تھی کہ ان کا حساب چاند کے گھٹاؤ اور بڑھاؤ پر تھا - دریائے تاجہ میں جہاں یہ گھڑیاں بنائی گئی تھیں - جوار بھاٹا نہیں آتا اس لئے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاند کی کشش سے ان کا کچھ تعلق نہ تھا بلکہ حکمت یہ رکھی گئی تھی کہ گھڑی کا $\frac{1}{14}$ حصہ چوبیس گھنٹے میں بھر جائے اور جب ایک دفعہ بھر جائے تو پھر اسی طرح خالی

ہو۔ چاند کی تاریخوں سے مطابقت گھڑی کو چلاتے وقت کر دی جاتی ہو گی۔ اس مکان کے کھنڈر جس میں یہ گھڑیاں تھیں۔ اب تک موجود ہیں۔ لیکن گھڑیاں کہاں نصب تھیں یہ پتہ نہ چل سکا۔ مسلمان مورخین نے طلیطلہ کے ایک پل کا حال بھی لکھا ہے۔ (نفح الطیب۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۰۱) و (حصہ دوم صفحہ ۶۷۳) جس کی بیچ کی کمان بہت عظیم الشان تھی۔ دونوں جانب چھوٹی چھوٹی کمانیں تھیں۔ یہ پل ۳۰۰ ہاتھ لمبا تھا اور کوئی ۸۰ ہاتھ چوڑا اس کے ایک جانب ایک بہت بڑا رہٹ بھی تھا جس کی بلندی سطح آب سے نوے گز کے قریب تھی۔ رہٹ کے ذریعہ سے پانی پل کے اوپر آتا تھا۔ اور سارے شہر میں پہنچتا تھا۔ امیر محمد کے زمانہ میں جب اہلِ طلیطلہ نے بغاوت کی تو یہ پل توڑ دیا گیا چنانچہ ایک عربی شاعر لکھتا ہے :۔

ما کان یبقی اللہ قنطرۃ نصبت الحمل کتابت الکفر

یہ پل اب تک موجود ہے اور القنطرہ کے نام سے مشہور ہے۔ عیسائیوں کے زمانہ میں اس کی ضروری مرمت ہوئی ہو گی لیکن اس کی اصل ساخت میں کچھ تغیر نہیں ہوا۔ بیچ کی بڑی کمان اور بازو کی دو چھوٹی چھوٹی کمانیں اپنی قدیم ہیئت پر قائم ہیں۔ پل کے طول اور عرض کو میں ناپ نہ سکا۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے۔ ۸۰ ہاتھ چوڑا ہرگز نہیں۔ پایوں کے استحکام کے واسطے تہونیوں کے طور پر چوڑے چوڑے پیل پائے چن دئے ہیں۔ اور ان کی بالائی سطح کو پل میں شامل کر لیا ہے۔ اس لئے پایوں کے قریب پل کی چوڑائی خاصی ہو گئی ہے۔ لیکن وہاں بھی ۸۰ ہاتھ تو نہ ہو گی پل کے شروع اور آخر میں دونوں جانب سنگین برج ہیں۔ یہ حفاظت کے لئے بنائے جاتے تھے۔ عیسائیوں کے زمانہ میں ان برجوں کی ہیئت بہت بدل گئی۔ چنانچہ جانب شہر جو برج ہے۔ اس پر شینت الالفینش کا پتلا بھی نصب ہے۔ ایک کتبہ بھی کندہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴۸۹ء میں میریق نے برج کی تجدید کی ہے۔

القنطرہ کے سامنے ہی پہاڑی پر ایک مختصر سا قلعہ ہے یہاں پہلے ایک خانقاہ تھی چونکہ یہ مقام شہر سے بالکل باہر تھا اور غنیم کا اس پر قبضہ ہو جانے سے شہر کی فصیل اور قلعہ دونوں زد میں آجاتے تھے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ خانقاہ کو توڑ کر قلعہ بنا دیا گیا ہے۔ عمارت زیادہ مستحکم نہیں ہے۔ روکار اینٹوں کی ہے۔ لیکن برجوں اور فصیلوں کی ساخت عربی وضع کی ہے اور کمانوں اور کھڑکیوں کا انداز بھی وہی ہے۔ عمارت کی حالت خستہ ہے۔ اور صرف برج اور فصیل ہی باقی رہ گئے ہیں۔

القنطرہ کے علاوہ دریائے تاجہ پر ایک اور پل بھی ہے جس کو الفنش دہم (۸۹ - ۱۲۵۲ء) نے بنوایا تھا۔

اس کی وضع بھی بالکل القنطرہ کی سی ہے۔ پل جنگی ہنگاموں میں کئی دفعہ توڑا گیا اور آخری دفعہ ۱۷۹۵ء میں بنا شہر کی جانب پل کی حفاظت کے لئے دو نہایت مستحکم برج ہیں۔ ان کی ہیئت مربع ہے۔ اور عمارت کی شان عربی ہے۔ پل کے دوسرے جانب صرف ایک برج ہے اس کی وضع بھی عربی ہے۔ اور دروازے کی کمان نعل کی شکل کی ہے۔ برج کی مرغولیں بھی اسلامی طرز کی نہیں۔ پل کے نیچے دریا تاجہ بہت تیزی سے بہتا ہے۔ اور اس پار پہاڑیاں ہیں۔ جہاں سے شہر کا منظر بہت دلکش ہے۔ طلیطلہ کی آبادی ایک پہاڑی کی آغوش میں لپٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور قلعے کے برج جن کا عفریتانہ پیکر اب بالکل مسخ ہوگیا ہے حفاظت کے لئے قائم ہیں۔

اسلامی زمانہ کی اصل یادگار لے دے کر فقط ایک چھوٹی سی مسجد رہ گئی ہے جس کی بابت یہ روایت مشہور ہے کہ ابتدا میں وہاں کنیسہ تھا۔ جب طارق نے شہر کو فتح کیا تو کنیسہ کے قسیسوں نے اس غرض سے کہ صلیب کی بے حرمتی نہ ہو اس کے سامنے دیوار چن دی اور شمعیں جو صلیب کے سامنے روشن تھیں ان کو اسی طرح سے روشن چھوڑ دیا ——— جب چار سو برس کے بعد عیسائیوں کا شہر پر پھر تسلط ہوا اور دیوار جو صلیب کے سامنے چن دی گئی تھی گرائی گئی تو کہتے ہیں شمعیں اسی طرح سے روشن تھیں۔ اس رعایت سے کنیسہ کا نام جو اب تک موجود ہے۔ (Christo de la luz) یعنے روشنی والے مسیح کا گرجا ہوگیا۔ عمارت اندر سے ۲۱ فٹ ½ ۷ انچ لمبی اور ۲۰ فٹ ۲ انچ چوڑی ہے۔ بیچ میں چار چھوٹے چھوٹے ستون قائم ہیں جن کے پرکالے (Capitals) مختلف وضع کے ہیں۔ ستونوں سے تین تین در کے دالان بن گئے ہیں۔ اور چھت نو گنبدوں پر منقسم ہے۔ محرابوں کی وضع نعل کی شکل کی ہے اور بالائی حصہ میں گلابی اور سبز اینٹوں کا کام ہے۔ چھت کے گنبدوں کو آڑی کمانوں کے زور پر قائم کیا ہے یہ عمارت نہایت مختصر ہے اور اسلامی زمانہ میں اس کی شاید اس وجہ سے وقعت ہو تو ہو کہ گرجا کو توڑ کر بنائی گئی تھی۔ ورنہ تعمیری شان قابل لحاظ نہیں۔ طلیطلہ کی جامع مسجد اس جگہ تھی۔ جہاں اب بڑا کنیسہ ہے۔

مسجد کے علاوہ شہر پناہ کی اندرونی دیوار بھی مسلمانوں ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ گو عیسائیوں نے اس میں بہت کچھ ترمیم و تجدید کی ہو۔ طلیطلہ کی اسلامی طرز کی عمارات میں سب میں بہتر (Puerta del sol) باب الشمس ہے اس کے متعلق بعض محققین کا یہ خیال ہے کہ آخری اسلامی عہد کی نشانی ہے۔ اور بعض اس کو عیسائیوں کے دوبارہ تسلط ہونے کے بعد کے ابتدائی زمانہ کی سمجھتے ہیں۔ لیکن اس میں سب کو اتفاق ہے کہ اس کا

طرزِ تعمیر اسلامی ہے۔ عمارت ایک دروازہ اور دو برجوں پر مشتمل ہے۔ برجوں میں سے ایک مربع ہے اور دوسرا مدور۔ بیچ میں دروازے کی محرابیں نعل کی شکل کی ہیں۔ گو روکار کی بالائی محراب کسی قدر نکیلی ہے۔ عمارت نہایت سنگین بنی ہوئی ہے۔ اس لئے روکار میں اگر اینٹوں کے کام کی محرابوں کا جال نہ بنایا جاتا اور برجوں میں چھوٹی چھوٹی خوبصورت کھڑکیاں نہ تعمیر کی جاتیں تو دروازے کی صورت مہیب رہتی۔ اور سنگینی کے باوجود جو حسن اب پیدا ہوگیا ہے وہ نہ ہوتا۔ اربابِ فن نے اس دروازہ کی دل کھول کر تعریف کی ہے اور بعض نے تو آسمان پر چڑھا دیا ہے۔ چنانچہ حنا لنچ (Hanna lynch) لکھتا ہے۔ "اس دروازہ کی تعریف میں ہم کو مبالغہ کرنے دو۔ کیونکہ متانت کی دیوی ہمارے جذبات کو نہیں روک سکتی۔ اگر یہ عمارت صحرا میں بھی واقع ہوتی تو اس کے دیکھنے کے لئے سفر کی صعوبتیں اٹھانی گوارا تھیں۔ زائرین خواہ کتنی ہی دور سے آئے ہوں اسکو دیکھ کر ضرور شکر گزار ہونگے دروازہ فن تعمیر کے کمال کا ایک عجیب نمونہ ہے جسکا دنیا میں شاید مشکل سے جواب ملے"۔ یہ نادر عمارت افسوس ہے آج کل بے غوری کی حالت میں ہے۔ صفائی کا مطلق انتظام نہیں اور جو ترمیم ہوئی وہ سلیقہ سے نہیں کی گئی۔

اسلامی حکومت کے زوال کے بعد جو طرزِ تعمیر ہسپانیہ میں رائج ہوا۔ اس کا اصطلاحی نام (Mudejar) ہے۔ یہ ہسپانوی لفظ ہے اور متاخر کا بگڑا ہوا ہے۔ انگریزی میں اس کا مترادف (Post - Islamic) ہوگا۔ اس طرز کی خصوصیات کا میں قرطبہ اور غرناطہ کی عمارات کے حالات میں تفصیل سے ذکر کرونگا۔ لیکن طلیطلہ کی چند عمارات کا حال چونکہ اب مجھ کو بیان کرنا ہے جو اسی طرز کی بنی ہوئی ہیں۔ اس لئے اتنا جتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس طرز میں سنگتراشی اور منبت کاری کی بجائے چونے کی گلکاری نے زیادہ رواج پایا۔ محرابوں سے رفعت و قوت غائب ہوگئی۔ اور ان کی جگہ نزاکت اور تنوع نے لے لی چھتوں کی آرائش میں لکڑی کے کام کی اعلیٰ صنعت کی بجائے زرنگاری زیادہ پسند کی جانے لگی اور سنگ مرمر کی جگہ رنگین اینٹیں کثرت سے استعمال ہونے لگیں۔ اس طرز کو ابتدائی اسلامی طرز سے وہی نسبت ہے جو لکھنو کے امام باڑے کو دہلی اور آگرے کی عمارات سے۔ متاخر طرزِ تعمیر کی وضاحت کے لئے میں اسرائیلیوں کے دو معبدوں کا ذکر کروں گا۔ ایک کا نام (Santa Maria la Blanca) ہے اور دوسرے کا نام (Santa Maria La Blanca-El Transito) مقدم الذکر شنت مارین کے پل کے نزدیک واقع ہے۔ یہ معبد مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے زمانہ میں تعمیر ہوا۔ اور ۱۴۵۰ء تک اس میں اسرائیلیوں کے اعتقاد کے موافق عبادت ہوتی رہی۔ بعد میں کنیسہ تک گرجا ہوگیا۔ عمارت کی روکار نہایت بدوضع

ہے اور معلوم ہوتا ہے عیسائیوں کے زمانہ میں اس میں بہت رد و بدل ہوا۔ اندرونی ہیئت میں کوئی اسرائیلی خصوصیت نہیں ہے ایک صدر ایوان ہے جس کے پہلوؤں میں دو دو دالان اور ہیں۔ سترہویں صدی میں صدر ایوان کو مذبح کرنے کی غرض سے ایک جانب سے مدور کیا گیا ہے۔ عمارت اندر سے ۸۱ فٹ طویل اور ۶۳ فٹ عریض ہے۔ صدر ایوان کی چھت کی بلندی ۶۰ فٹ ہے۔ اور دالانوں کی چھت کی تقریباً ۴۰ فٹ۔ دالانوں اور صدر ایوان میں ہشت پہلو ستونوں کی چار قطاریں ہیں۔ ان کے پرکالے بجائے سنگتراشی کے کام کے چونے کی گلکاری سے مزین ہیں۔ محرابوں کی وضع قدیم اسلامی طرز کی ہے۔ صدر ایوان میں چھت کے نیچے دیواروں پر ایک حاشیہ نہایت خوبصورت ہے۔ چھت لکڑی کی ہے اور بنگلہ نما ہے۔ دوسرا اسرائیلی معبد بھی قریب ہی میں واقع ہے۔ اس کی اندرونی ہیئت پہلے معبد سے مختلف ہے۔ بجائے صدر ایوان اور دالانوں کے ایک وسیع مستطیل کمرہ ہے جس کا طول ۷۲ فٹ۔ عرض ۳۱ فٹ اور ارتفاع ۴۴ فٹ ہے۔ دیواریں ۲۰ فٹ کی بلندی تک سادہ ہیں لیکن چونے کی گلکاری کے حاشیے اور عبرانی کتاب موجود ہیں۔ کتابوں کے اوپر محراب نما کھڑکیاں ہیں۔ جن کی جالیوں کی نزاکت کی تعریف کرنی واقعی بیان سے باہر ہے۔ چھت (Cedar) کی ہے اور نہایت نفیس ہے۔ اس کی بھی وضع بنگلہ نما ہے۔

(Mudejar) متاخر طرز کی بہترین مثال دو مکان ہیں جو (Casar del mesa) اور (Teller del mona) کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ دونوں غالباً عیسائیوں کی فتح کے زمانے میں تعمیر ہوئے تھے۔ ان میں چونے کی گلکاری جالیوں کی نفاست اور چھت کی لکڑی کے کام کی خوبصورتی بے شک قابل داد ہے اول الذکر کی ہیئت ایک مستطیل ایوان کی سی ہے جس کا طول ۶۰ فٹ عرض ۲۲ فٹ اور بلندی ۳۶ فٹ ہے۔ صدر دروازہ نعل کی شکل کا ہے اور جالی کا کام خوب ہے۔ دیواروں کے حاشیے بھی نہایت خوبصورت ہیں۔ (Teller del Mona) جیسا کہ نام سے واضح ہوتا ہے کسی مسلمان امیر کا مکان تھا۔ عمارت میں کچھ عربی کتبے بھی ہیں۔ آج کل یہاں ایک نان بائی کا دفتر بھی ہے۔ بیچ میں ایک صدر ایوان ہے۔ اور پہلوؤں میں دونوں جانب بڑے بڑے حجرے ہیں۔ صدر ایوان کا طول ۴۵ فٹ اور عرض ۲۳ فٹ ہے۔

طلیطلہ میں ان عمارات کے علاوہ چند اور عمارتوں میں بھی جن میں طرز متاخر کا اثر موجود ہے۔ مثلاً۔ (San Juan De Los Reyes) یا (Santa Cruz) یہ دونوں پندرہویں صدی کے

گوتھک طرز (قوطی) کی عمارتیں ہیں۔ اول الذکر کو شاہ فرڈیننڈ نے اپنے دفن ہونے کے لئے بنایا تھا۔ اور دوسری شفاخانہ کے واسطے تعمیر ہوئی تھی۔ شینٹ کرنتو کے صدر ایوان کی چھت اور خانقاہ کے بالاخانے کا پتھر کا کٹہرہ اسلامی وضع کا ہے۔ اسی طرح شینٹ جوئین میں بھی آرائشی کام بعض جگہ اسلامی طرز کا ہے۔ اس معبد کی خانقاہ قوطی مرصع طرز کی بہترین مثال ہے۔

قوطی وضع کی عمارتوں میں طلیطلہ کا بڑا گرجا نہایت مشہور ہے۔ مکانات نے جو اس کے اردگرد بن گئے ہیں اس کی رونق کو خراب کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں لوہے کی چھتری جو مینار پر نصب کی گئی ہے۔ اس سے بھی بدنمائی پیدا ہو گئی ہے۔ تاہم عمارت کی اندرونی ہیئت نہایت موثر ہے۔ اور سرودگاہ کا لکڑی کا کام تو دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

پچاس نشست گاہیں بنائی گئی ہیں اور منبت کاری میں غرناطہ کی لڑائیوں کے مناظر دکھائے گئے ہیں مسلمان کے دل پر ان کو دیکھ کر کیا ہی صدمہ ہو۔ لیکن صنعت کے لحاظ سے کوئی صاحب ذوق تحسین کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گرجا کے بعض ایوان کی چھتیں اسلامی وضع کی ہیں اور عمارت کے صدر حصہ میں اندرونی دالان کے اوپر جو محرابی دروازوں کا سلسلہ ہے وہ بھی اسلامی ہے۔

کنیسہ کے اندر ملبوسات جواہرات، تصاویر اور تبرکات کا عظیم الشان ذخیرہ ہے۔ قسیسوں کے زرق برق جبے اور مکمل اور مرصع عصا، صلیبیں اور ظروف دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ میری نظر میں یہ تکلف تو کسی شاہی توشہ خانہ میں بھی نظر نہیں آیا۔ حالانکہ یورپ کے اس سفر میں میں نے بہت جگہ شاہی محلات اور توشہ خانے دیکھے۔

تصاویر کا مجموعہ بھی نہایت نفیس ہے لیکن سب مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ حضرت مریم کی ایک تصویر پچکاری کے کام کی بنی ہوئی ہے۔ پتے اسقدر چھوٹے چھوٹے ہیں کہ ان کے جوڑوں پر نظر کام نہیں کرتی۔ ایک حجرے میں جہاں خاص تبرکات اور جواہرات کا مجموعہ ہے۔ الماریوں پر پردوں کے طور پر چند اسلامی جھنڈے بھی آویزاں ہیں جو عیسائیوں کو لڑائی میں ہاتھ لگے تھے۔ ان پر قرآنی آیات زردوزی کے کام میں لکھی ہوئی ہیں چونکہ اسلامی زمانہ کے کپڑے اب اسپین میں بالکل عنقا ہیں۔ اس لئے نساجی کے قدیم ہنر کے دیکھنے کے لئے اس سے بہتر اور اصلی نمونے میسر آنے ناممکن ہیں۔

ہسپانیہ کی قومی یادگاروں میں دو مکان قابل ذکر ہیں۔ ایک مشہور مصنف Cervantes کا ہے جس کو اسی حالت میں قائم رکھا ہے اور مدت سے سرائے کے طور پر استعمال ہوتا ہے چھوٹا سا صحن ہے۔ اس کے چاروں طرف حجرے ہیں۔ ان کے اوپر ایک اور منزل ہے اور لکڑی کا سادہ برآمدہ ہے دیہات سے ہسپانوی کاشتکار خچروں کی گاڑیوں میں اناج میوہ، شراب بھر بھر کر لاتے ہیں۔ اور یہاں آکر ٹھہرتے ہیں۔ رات کو جب کام کاج سے فارغ ہوتے ہیں تو بڑے بڑے لکڑی کے پائپ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ شراب کا بھی دور چل جاتا ہے اور پھر بزرگوں کے کارنامے بیان ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی سازندہ بھی آموجود ہوتا ہے میں نے ان جلسوں کا اسپین کے بعض مقامات میں خوب لطف اٹھایا ہے۔

دوسرا مکان مشہور نقاش ایل۔ گریکو کا ہے۔ اسکو بھی ایسی حالت میں قائم رکھا ہے اور جتنی تصویریں اور خاکے اس مصور کے مل سکے ہیں ان کو مکان میں سجا دیا گیا ہے۔ دوسرے نقاشوں کی تصویریں بھی سجائی ہیں چنانچہ ایک تصویر ویلسکٹ کی مجھے یہاں بہت پسند آئی۔ عربی وضع کی چینی کاری کے نمونے بھی یہاں ہیں اور ایک کمرے کو باورچی خانہ کے طور پر مع جملہ سامان کے دکھایا ہے۔

عربی تاریخوں میں طلیطلہ کے بیان میں یہاں کی خاص صنعتوں اور پیداوار کا بھی ذکر ہے۔ زعفران کثرت سے ہوتی تھی۔ ایک قسم کے گوند کا بھی ذکر ہے جس کو صمغ السمائی لکھا ہے۔ تلوار اور ہتھیار بنانے کی صنعت کمال پر پہنچ گئی۔ اور دستوں پر طلائی کام لاجواب ہوتا تھا۔ یہ کام اب بھی ہوتا ہے لیکن جاپان کی نقل نے اصل کی قدر کھو دی ہے۔

شہر میں قدامت کی شان اب تک باقی ہے۔ پتلی پتلی گلیاں ناہموار روڑوں کے فرش مکانات کی پرانی وضع یہ سب ایسے عناصر ہیں کہ سیاح وہاں پہنچ کر بھول جاتا ہے۔ کہ وہ بیسویں صدی میں زندگی بسر کر رہا ہے بلکہ کبھی وہ اپنے آپکو رومانوی سورماؤں سے مشغول گفتگو پاتا ہے۔ کبھی خونخوار اور ناتراشیدہ قوطیوں سے کبھی لطیف مزاج البیلے اندلسی عربوں سے میں نے طالب علمی کے زمانہ میں ۲۰ بیت کا ایک مرثیہ طلیطلہ کی بربادی کا پڑھا تھا۔ اس کا پورا لطف انیس برس کے بعد اب شہر کے کھنڈرات دیکھ کر آیا۔

مراسلات و اقتباسات

۱۔ مسلمانوں کی آمدنی اور خرچ

ذیل میں اس خطبۂ صدارت کے چند اقتباسات درج ہیں جو انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے پنجاہ سالہ جشن کے موقعہ پر پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب نے شعبۂ معاشیات و اصلاح معاشرت میں ارشاد فرمایا اور جو قارئین طلوعِ اسلام کی خاص توجہ کا مستحق ہے ——— مدیر

معاشیات کے تحت اصلاح معاشرت مقصود ہو تو ایک ہی سوال پیدا ہوتا ہے جو سب پہلوؤں پر حاوی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آمدنی اور خرچ میں کیا تناسب کس طرح قائم کیا جائے کہ زندگی ایمانداری اور خود داری سے بسر ہو۔ اصل اصول سب کو معلوم ہے کہ آمدنی خرچ سے بڑھی رہے یا خرچ آمدنی سے گھٹا رہا۔ اگر خرچ بڑھانے کی خواہش ہو تو آمدنی بڑھانے کا حوصلہ اور موقع ہونا چاہئے ورنہ کمتر خرچ پر قانع رہنا چاہئے۔ یہی دو صورتیں ہیں جو قرینِ اصول اور قرینِ مصلحت ہیں لیکن ایک تیسری صورت جو پس ماندہ ممالک میں تباہی پھیلا رہی ہے وہ یہ ہے کہ آمدنی بڑھنے کے بجائے گھٹ رہی ہے اور خرچ گھٹنے کے بجائے بڑھ رہا ہے اور اس عدم توازن سے جو کمی پڑتی ہے وہ قدیم آبائی اندوختوں سے پوری کی جاتی ہے خواہ وہ زر و جواہر کی شکل میں ہوں۔ نقد رقم کی شکل میں یا جائداد کی شکل میں اس صورت سے کچھ مدت کام چلتا ہے اور خوشحالی کا دھوکا رہتا ہے۔ لیکن لازمی انجام تباہ حالی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں بڑے بڑے متمول خاندان اس طرح تباہ ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔ خاص کر مسلمان اسراف کی بلا میں زیادہ پھنسے۔ وجہ یہ کہ حکمرانی سے محکومی میں گرے اور بری طرح گرے لیکن معیار زندگی وہی حکمرانی کا برقرار رکھنا چاہا اور اس کو لازمۂ وضعداری سمجھا۔ ایک دو پشت یہ نمائشی وضعداری نبھ گئی اور اس دوران میں نقدیاں ختم ہو گئیں، جائدادیں فروخت یا نیلام ہو گئیں۔ افلاس کا دور شروع ہو گیا۔ ہزارہا شریف خاندان اس بھنور میں ڈوب گئے اور اب بھی بہت سے اس میں پڑے چکر کھا رہے ہیں نکلنا دشوار نظر آتا ہے۔

آمدنی کے ذرائع اجمالی طور سے دیکھئے تو چار مدات نظر آتی ہیں۔ اول سب سے بہتر معاشی کمائی ہے جس کی تین

شکلیں ہیں۔ زراعت۔ صنعت و حرفت اور تجارت۔ آمدنی کی دوسری مد چوری اور سینہ زوری ہے جس میں رشوت اور غبن کے سوا رشوت بھی داخل ہے خواہ وہ دوستانہ تحفہ تحائف کی مہذب شکل میں وصول کی جائے۔ آمدنی کی تیسری مد بھیک اور خیر خیرات ہے جس میں سب نہیں لیکن پھر بھی کافی حد تک قومی چندے اور مذہبی نذریں داخل ہو سکتی ہیں اور چوتھی مد لوگ کہتے ہیں کہ دستِ غیب ہے لیکن وہ غیب ہی کیا جس کا پتہ چل جائے۔ بہت سے اس کی تلاش میں خود ہی غائب ہو گئے۔ بہر حال آمدنی کی بہترین مد معاشی کمائی ہے۔ جس قوم کے بیشتر افراد معاشی ذرائع سے آمدنی پیدا کریں گے۔ وہ قوم خوشحال رہے گی اور جہاں دوسری مدوں کی آمدنی پر بسر اوقات ہو لامحالہ وہاں آج نہیں تو کل افلاس پھیل جائے گا۔

کمائی کے معاشی ذرائع میں زراعت کی جو ابتر حالت ہے محتاج بیان نہیں۔ تفصیلات سے تو تصانیف بھری پڑی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ شعبہ زراعت میں پہلے ہی اتنا ہجوم ہے کہ کسی اضافہ کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ ملک کی تین چوتھائی آبادی زراعت پر گزر کر رہی ہے اور اس کا بیشتر حصہ خستہ حال ہے۔ کاشتکار زمیندار ساہوکار اور سرکار میں چوگڈا پیچ پڑا ہوا ہے اس پیچ کا نکلنا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کشمکش میں زمیندار کی حالت روز بروز نازک ہوتی جاتی ہے۔ اس کی ملکیت اور آمدنی دونوں خطرے میں ہیں۔ کمائی کا دوسرا ذریعہ صنعت و حرفت ہے۔ جب سے بڑے بڑے کارخانے کھلے اور بدیسی سامان ارزاں بکثرت آنے لگا۔ ملک کی چھوٹی اور گھریلو صنعتیں پامال ہو گئیں۔ روزی کے بہت سے دروازے بند ہو گئے یوں تو صنعت و حرفت کی تفصیل بہت طویل ہے پھر بھی متعدد مروجہ پیشے ایسے ہیں جن میں اصلاح و ترقی کی کافی گنجائش موجود ہے مثلاً سنگ تراش ہیں، معمار ہیں، بڑھئی ہیں، لوہار ہیں، رنگریز ہیں، درزی ہیں، دھوبی ہیں، سنار ہیں، حجام ہیں، موچی ہیں، باورچی ہیں، دست کار ہیں، یہ سب طبقے بالعموم جاہل ہیں اور یہ سب پیشے رسماً رذیل سمجھے جاتے ہیں۔ ہندو تعلیم کے زیر اثر پیشے ذات شمار ہوتے ہیں مثلاً کسی نے درزی کا کام کیا تو گویا اس کی ذات درزی ہو گئی اور کسی نے سنار کا کام کیا تو اس کی ذات سنار ہو گئی۔ لیکن اسلامی تعلیم نے حلال و حرام کا معیار قرار دے کر اکل حلال کو باعث عزت اور اکل حرام کو باعث ذلت قرار دیا۔ پیشہ کا ذات سے کوئی تعلق نہیں رکھا تعظیم و تکریم کا مدار تقویٰ پر رکھا جس سے مراد علم صحیح اور عمل صالح کا اجتماع ہے۔ غرضیکہ عام مفید پیشوں سے جو ذلت وابستہ ہو گئی تھی۔ اسلام نے اس کو رفع کر دیا چنانچہ خود

بزرگانِ دین نے مختلف پیشے اختیار کر کے عملی طور پر پیشوں کی توقیر قائم کی اور بنی نوع انسان کے واسطے حصولِ معاش کے ذریعے پاک اور وسیع کر دئے۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے میل ملاپ سے ہندوؤں میں ذات پات اور پیشوں کی بندشیں نسبتہً ڈھیلی پڑ گئیں اور مسلمانوں میں یہ تفریقات نئے سرے سے داخل ہو کر پھیل گئیں۔ گویا فریقین نے فریقین کو متاثر کیا۔ چنانچہ مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ تنگدستی گوارا لیکن پیشے اختیار کرتے جھجکتے ہیں کہ مبادا ان کی ذات نیچی ہو جائے حالانکہ اسلامی ممالک میں لوگ اب بھی حسبِ ضرورت ایسے پیشے اختیار کرتے ہیں جن سے اکل حلال حاصل ہو۔ جو پیشے ہندوستان میں رذیل سمجھے جاتے ہیں۔ یورپ میں ان پیشوں کی جو قدر ہے اور ان سے معاش میں جس درجہ وسعت پیدا ہوئی ہے وہ بہت سبق آموز ہے غرض وقت آگیا ہے کہ شریف نوجوان اپنی آستینیں چڑھائیں اور پیشوں میں لگ جائیں۔ ذات بگڑنے کا خوف دل میں نہ لائیں۔ ایمانداری، ہوشیاری اور مستعدی سے کھائیں کمائیں۔ بیکاری اور ناداری سے نجات پائیں۔

چونکہ صدیوں حکمران رہے مسلمانوں کو اب بھی سرکاری نوکری کا شوق ہے۔ خاص کر جس ملازمت میں حکومت کا موقع زیادہ ملے اور اپنی طبعی مناسبت سے حکومت کے عہدوں پر نسبتہً بہتر کارگزار ثابت ہوتے ہیں لیکن اول تو انہوں نے جدید تعلیم شروع کرنے میں دو پشت تاخیر کی، ان کے داخل ہونے تک ملازمت کے علاقے گھر چکے تھے۔ کچھ منت سماجت اور کچھ ڈراوے دھمکاوے سے تھوڑی جگہ مل گئی۔ لیکن ملازمت کی بھی ایک حد ہے آخر پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ملازموں میں تخفیف کی نوبت آرہی ہے تو پھر امیدواروں کا کیا ٹھکانہ ہے۔۔۔ رہا کمائی کا تیسرا معاشی ذریعہ جس کو تجارت کہتے ہیں۔ اس میں ہندوستانیوں کا حصہ بہت کم ہے اور ہندوستانیوں میں مسلمانوں کا حصہ اس سے بھی کم ہے جس پیمانہ پر آج تجارت چلتی ہے اس کے واسطے بڑے سرمایہ اور بڑے جتھے کی ضرورت ہے بالعموم ہندوستانیوں کے پاس سرمایہ کم ہے اور بالعموم مسلمانوں کا تجارتی حصوں میں گزر مشکل ہے۔ تجارت کے نام سے ہندوستانی جو کام کرتے ہیں وہ دراصل ایجنسی ہوتی ہے اور اس کے تحت خرد فروشی چلتی ہے۔ لیکن تجارت کی کنجی ہندوستان میں بالعموم یورپین کمپنیوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے واسطے تصانیف درکار ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تجارت اتنی آسان نہیں جتنی کہ ناتجربہ کاری سے آسان سمجھی جاتی ہے۔ سرمائے اور جتھہ بندی کے سوا اس کام میں وسیع معلومات اور کثیر تجربہ کی ضرورت ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں کاروباری تعلیم و تربیت کا

خاص اہتمام ہے۔ لیکن ہندوستان میں ایسے مواقع بہت کمیاب ہیں پھر بھی ایجنسی اور خردہ فروش تجارت میں تعلیمیافتہ نوجوان اپنی جگہ نکال سکتے ہیں۔

آمدنی کے بعد اب خرچ کو لیجئے۔۔۔ کسی فرد یا خاندان یا قوم کو جو ضروریات لاحق ہوتی ہیں وہ مجموعی طور پر معیارِ زندگی کہلاتی ہیں۔ اگر ضروریات قلیل اور ادنیٰ ہیں تو گویا معیار زندگی پست ہے اور اگر ضروریات کثیر اور اعلیٰ ہیں تو گویا معیارِ زندگی بلند ہے۔ ضروریاتِ زندگی کثیر ہوں اور اعلیٰ ہوں۔ معاشی ترقی اسی کا نام ہے۔ تہذیب جدید کا یہی خاص پیام ہے۔

قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ معیار زندگی کا صحیح اصول کیا ہے۔ اس معاملہ میں دو گروہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے۔ ایک گروہ نے دنیا ہی کو سب کچھ سمجھا اور اس کے حصول میں ہمہ تن منہمک ہو گیا کہ ایمان و اخلاق، دین و عقبیٰ سب فراموش ہو گئے گویا یہ گروہ دنیا میں غرق ہو گیا۔ دوسرے گروہ نے دنیا کو سراسر ہیچ سمجھا اور اس سے حتی الوسع احتراز کیا کہ جوگ اور رہبانیت تک نوبت پہنچ گئی۔۔۔ تیسرے گروہ نے معیار زندگی کے متعلق ایک اصولی مسلک پیش کیا۔ اس نے علم صحیح اور عملِ صالح پر زور دیا اور حصولِ دنیا کی کمی بیشی کو لوگوں کے حوصلے پر چھوڑ دیا۔ گویا خوبی اور خرابی کا معیار علم و عمل قرار پایا۔

چونکہ علم و عمل کا ظہور دنیوی تعلقات میں زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس گروہ نے تحصیل دنیا کو ترکِ دنیا پر ترجیح دی کہ علم و عمل کا کمال ظاہر ہو۔ چنانچہ انسانیت کے بہترین نمونے نبی اور رسول مانے جاتے ہیں۔ ان میں بادشاہ بھی ہوئے وزیر بھی ہوئے۔ دنیا دار بھی ہوئے یعنی ان کے بیوی بچے تھے گھر بار تھے کاروبار تھے۔

اگر دنیا کو ایک دریا مانا جائے تو ان تینوں گروہ کی ایسی مثال ہے کہ ایک دریا میں کود اگر تیراک نہ تھا۔ ہاتھ پیر مار کر ڈوب گیا دوسرا دریا کے کنارے بیٹھا رہا۔ ڈوبنے کے خوف سے دریا میں نہ اترا تیسرے نے تیراکی کا فن سیکھا اور دریا میں اتر کر خوب کمال دکھایا۔

بہرحال معیارِ زندگی جیسا کچھ بھی ہو۔ انسان کی جو ضروریات لاحق ہوتی ہیں وہ اصولاً چار درجوں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ اول ضروریاتِ حیات۔ دوم ضروریاتِ کارکردگی۔ سوم ضروریاتِ راحت۔ چہارم ضروریاتِ عیش۔ ضروریاتِ حیات وہ ہیں جن کے بغیر زندگی دشوار ہے۔ مثلاً ہوا۔ روشنی۔ پانی۔ کھانا۔ ضروریاتِ کارکردگی وہ ہیں

جن کے بغیر کام خوبی سے انجام دینا دشوار ہے مثلاً صحت - قوت - تعلیم و تربیت - ضروریاتِ راحت وہ ہیں جو محنت کے بعد آرام پہنچائیں اور صحت و طبیعت کو درست رکھیں - مثلاً سیر و تفریح - ضروریاتِ عیش وہ ہیں جن میں لذتِ نفس کی خاطر دولت اور وقت کو بے دریغ صرف کیا جائے -

بہر حال اصول یہ ہے کہ ضروریاتِ حیات سب پر مقدم ہیں - اول ان کی سربراہی ہونی چاہیئے اور وافر ہونی چاہیئے - ان کے بعد ضروریات کارکردگی ہیں ان کا اہتمام کیا جائے اور خوب کیا جائے کہ یہ لازمۂ ترقی ہیں - ان کے بعد ضروریاتِ راحت کی باری آتی ہے - چونکہ کارکردگی کی مدد و معاون ہیں لہٰذا ان کی فراہمی بھی ضروری ہے ان سے مستفید ہونا گویا کارکردگی کی آبیاری کرنا ہے - البتہ ضروریات عیش سے جس قدر بھی احتراز کیا جائے کم ہے کہ یہ انحطاط کا پیش خیمہ ہیں اور بڑی بڑی حوصلہ مند قومیں عیش پرستی کی نذر ہو چکی ہیں -

شادی غمی اور دیگر تقریبات کے تباہ کن مصارف جو رسم و رواج کی خاطر برداشت کئے جاتے ہیں - وہ بھی قابل ترمیم و تخفیف ہیں - قدیم کی طرح جدید طبقوں میں بھی تقریبات کا اسراف بڑھ رہا ہے - صرف شکل اور محل کا فرق ہے - جدید ترین مہذب تقریب کونسل اور اسمبلی وغیرہ کے میعادی انتخابات ہیں - جن میں خلاف قاعدہ اور خلاف زیرباری کی حد تک زرپاشی کی جاتی ہے اور ضمیر فروشی کی تعلیم دی جاتی ہے - مالی زیرباری سے بڑھ کر اخلاق کی تضعیف و تخریب قابل توجہ ہے کہ اخلاق ہی معاشرت کا محافظ ہے -

خلاصہ یہ کہ اگر معاشیات کے تحت معاشرت کی اصلاح و ترقی مقصود ہے تو ہر خاندان - ہر جماعت اور تمام ملک با قاعدہ ضروریات کی تنقیح کرے حسب نوعیت ان کی تفریق کرے اور ان کی تکمیل میں لازماً یہ ترتیب قرار دے کہ حیات کارکردگی پر اور کارکردگی راحت پر اور راحت عیش پر مقدم ہے - جسم کی اصلاح و ترقی کے واسطے اچھی خوراک اور اچھی ورزش - دماغ کی اصلاح و ترقی کے واسطے اچھی تعلیم اور دل کی اصلاح و ترقی کیواسطے اچھی تربیت اور ان ترقیات کی حفاظت کیواسطے اچھا ماحول اور اچھی صحبت - اگر یہ ہندوستان کا معاشی اور معاشرتی نظام العمل قرار دیدیا جائے تو پھر یہی ہندوستانی نوجوان کچھ سے کچھ ہو جائیں اور بڑے بڑے کام انجام پائیں -

غرض کہ ملک و ملت کی فلاح کیواسطے نہ پہلے کام کی کمی تھی اور نہ اب کمی ہے بلکہ قومی ذمہ داریوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے - مذہبی اوقاف زکوٰۃ خیر خیرات اور عوام چندے - اگر انکا با قاعدہ انتظام ہو جائے تو قومی کاموں کی راہیں جو مالی دقتیں پیش آتی رہتی ہیں - وہ بڑی حد تک رفع ہو جائے اور اسکے ساتھ لازم ہو کہ قومی کاموں میں کفایت اور ایثار سے کام لیا جائے - امانت اور دیانت شرط مقدم قرار پائے

۲۔ پاکستان

ذیل کی عبارت اس نوشتے سے ماخوذ ہے جو ہمارے کرمفرما جناب محمد عبدالحق صاحب نے ازرہ عنایت لندن سے ارسال کی ہے۔ یہ ترشہ مس ٹی' فراسٹ کے اس مراسلے کا ہے جو انہوں نے پچھلے برس فسادات بمبئی سے متاثر ہو کر مدیر "گریٹ برٹن اینڈ ایسٹ" کو لکھا اور جس میں ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ مس صاحبہ کو مشرقی مسائل سے خصوصیت کے ساتھ دلچسپی ہے جن پر وہ اکثر اظہار خیال کرتی رہتی ہیں۔ بدقسمتی سے اس وقت بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں فرقہ وارانہ بلووں کا دور دورہ ہے ہمیں امید ہے کہ ان کی تجویز پر ہر محب وطن ہندوستانی ٹھنڈے دل سے غور کرے گا ——— مدیر

ہندو مسلم فسادات کی اصل وجہ وہ بنیادی اختلاف ہے جو مذہبی، روحانی اور نسلی اعتبار سے ان دونوں قوموں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کشمکش کا حل صرف یہ ہے کہ ان کے لئے ایک ملی وطن National Home طیار کیا جائے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور اس میں دو الگ الگ قومی حکومتیں قائم ہونا ممکن ہے۔

موجودہ وفاقی دستور جلد یا بدیر تبدیل کرنا پڑیگا اس لئے کہ اس کا مقصود دو ایسے عناصر کو آپس میں ملانا ہے جو طبعًا ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے اور وفاقی حکومت پر جس کی عملداری میں صوبہ سرحد، سندھ، کشمیر، صوبہ پنجاب اور بلوچستان کی پانچ ریاستیں بھی شامل ہیں۔ ——— ان صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد آبادی کا ۴/۵ واں حصہ ہے ——— ہندوؤں کا غلبہ رہیگا۔ لہٰذا ہندو اور مسلم کشمکش کا تسلسل اس وقت تک یقینی ہے جب تک ہم "پاکستانی تحریک وطنی" کا مطالبہ منظور کرتے ہوئے ان پانچ ریاستوں میں ہندی مسلمانوں کے لئے "ایک ملی وطن" کی تاسیس پر متفق نہیں ہوتے۔ یہی صرف ایک حل اس مسئلے کا ہے لہٰذا اس کو جسقدر جلدی منظور کر لیا جائے اسی قدر بہتر ہے ——— ہندو، مسلم اور انگریز تینوں جماعتوں کے لئے جن کو ہندوستان کے دو ملتین Bi-national براعظم کی مستقل بہبودی سے دلچسپی ہے۔

۳۔ ضرب کلیم کا گجراتی ترجمہ

(ذیل کی تحریر ایک نجی مراسلے سے ماخوذ ہے جو علامہ اقبال مدظلہٗ کی خدمت میں لکھا گیا)

خاکسار کو ۔۔ ۱۹۳۵ء کے اواخر میں جناب والا کے دولت کدہ پر مشرف بہ ملاقات ہوا تھا۔ ممکن

ہے کہ جناب کو خیال نہ رہا ہو۔ اس لیئے عرض ہے کہ ان دنوں خاکسار پر بہائی خیالات کا اثر تھا۔ ۔ اثنائے ملاقات میں جناب کی فرمائش پر میں نے جناب بہا اللہ کی ایک عربی عبارت پڑھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ "بالکل قرآن کا تتبع ہے" اس فقرے نے اس وقت تو خصوصیت سے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ مگر امتدادِ زمانہ۔ مزید مطالعہ اور غور و فکر اور عنایتِ خداوندی کا یہ اعجاز ہے کہ بحمد اللہ سب آفاقی رنگ دور ہو کر محض اسلام کا رنگ باقی رہ گیا۔ یعنی اب میں صرف "مسلمان" ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ جس طرح میں اسلام پر پیدا ہوا ہوں اسی طرح میرا خاتمہ بھی اسلام پر ہو۔ میرا اسلام خدا کی توحید محمدؐ کی رسالت و ختمیت نبوت کے بعد ابو بکرؓ سے لیکر علیؓ تک کی خلافت راشدہ اور اس کے بعد تمام صلحاء امت (جو خلافت راشدہ کے قدم بقدم ہیں) کو اپنے دامن میں لیئے ہوئے ہیں۔ میرے اس انقلاب ذہنی کا سبب جناب کا وہ فقرہ من وجہٖ اور اس کے بعد حضرت امام ابن قیم کے بعض رسائل اور ان کی سیرت رسول اور حضرت نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم کی بعض تالیفات خصوصاً قرآن پاک کا بنظرِ خاص مطالعہ ہوا ہے۔ چونکہ جناب کی تالیفات بھی اس خیال کی مؤید ثابت ہوئیں، اس لیئے آپ کے قلم سے اردو و فارسی نظم کی صورت میں اب تک جو کچھ نکلا ہے لفظاً لفظاً میں نے مطالعہ کیا اور اسے حرزِ جان بنا کر رکھا ہے۔ ۔ ۔ یہ ساری بے کیف داستان اس لئے عرض کی ہے کہ جناب والا راقم کو پہچان لیں۔ دوسرے یہ کہ خاکسار کے ایک محترم بزرگ دوست جو فارسی و گجراتی و اردو کے مسلمہ ادیب ہونے کے علاوہ زبان انگریزی کے بھی ماہر ہیں اور جن کا نام جناب سید ابراہیم محب قادری مدظلہٗ ہے، آپ نے خاکسار سے خواہش فرمائی ہے کہ خاکسار جناب کی خدمت میں عرض کرے کہ سید صاحب موصوف چاہتے ہیں کہ جناب کی نئی کتاب "ضرب کلیم" کو گجراتی زبان میں منتقل کر دیں تاکہ گجراتی زبان جاننے والے جناب کے خیالات سے مستفیض ہوں۔

دی یونائیٹڈ آکشن مارٹ

۲۵ - میکلوڈ روڈ - لاہور

ہر قسم کا سامان، نیا اور پرانا فرنیچر، دریاں، چینی کے برتن وغیرہ وغیرہ نیلام میں یا ویسے روزمرہ تشریف لا کر خریدیئے

یونائیٹڈ آکشن مارٹ میں سب سے بہتر اور سستی چیز ملتی ہے

۲۵ - میکلوڈ روڈ - لاہور

۴۔ طارق ابن زیاد کا خطاب

(اپنے آپ سے)

"اے طارق آج تو شاہانِ ہسپانیہ کے خزانے میں کھڑا ہے۔ دیکھ تو کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ شام سے طلیطلہ میں غریبوں کی جھونپڑی سے شاہوں کے خزانے میں مگر یاد رکھ ایک دن تجھے قبر میں بھی جانا ہے (بادشاہوں کے تاج دیکھ کر اور انہیں ہاتھ میں لے کر) تیرے ہاتھ میں یہ چمکدار چیزیں کیا ہیں جن پر نظر نہیں ٹھہرتی؟ بڑے بڑے بادشاہوں کے ٹوٹے پھوٹے تاج یہ آج تیری مٹھی میں ہیں، گذری ہوئی عظمت اور شوکت کے بچپن گواہ، مگر خود تو کیا ہے اے فتح مند سپہ سالار؟ فقط قبروں کا محافظ خبردار ان تاجداروں کی تقلید نہ کرنا۔ جو ان تاجوں کے مالک تھے وہ نادان اور مغرور تھے، انہیں انسان کی عاجزی اور بے کسی کا علم نہیں تھا اور زمانے کا تغیر نظر نہیں آتا تھا۔

آج تو ان کے شاندار محل میں کھڑا ہے، ان کی دولت کا مالک ہے۔ تو نے ان کے گڑے ہوئے خزانوں کو ڈھونڈھ لیا ہے۔

تقدیر کے دھارے کا پلٹنا دیکھ۔ اس جلیل القدر قوم کا پلٹنا دیکھ جو آج تیرے قدموں کے تلے ہے۔ یہ انقلاب تیرے ہی ہاتھوں ہوا ہے۔ مگر پھر بھی اے طارق ابن زیاد تو کیا ہے محض ایک ذرۂ بے مقدار۔

پڑھ اے طارق ابن زیاد پڑھ۔ ان میں سے ہر ایک تاج، ایک بادشاہ کی عبرت ناک داستان سناتا ہے۔

پڑھ اے ابن ناصر کے غلام۔

"راڈرک نے اپنی قوم پر ظلم کیا۔ اتنا ظلم کیا کہ آج قوم کے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ دانشمند اس کی صحبت سے پرہیز کرتے تھے۔ اس کے گرد خوشامدیوں کا حلقہ تھا اور اس کے ملک پر جاہلوں اور نااہلوں کی حکومت، اس شہر کی عمارتوں میں مجھے ایک مدرسہ، ایک ہسپتال بھی نظر نہیں آیا۔ جدھر دیکھئے محل ہیں، یا قید خانے، یا گرجے۔

راڈرک کو خبر نہ تھی کہ جس ملک کا بادشاہ ظالم ہو جس کے باشندے جاہل اور بے بس ہوں، اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔ کہ غیر قومیں اسے کچل کر رکھ دیتی ہیں۔"

عبدالحق حمید بے مرحوم

رسید کتب

غالب - از مولوی غلام رسول مہر بی - اے -

قادیانی مذہب (طباعت پنجم) از پروفیسر الیاس برنی -

سراپائے رسول صلعم - از اعجاز الحق صاحب قدوسی -

النبی الخاتم - از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی | **عرضِ احسن** - از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

سلطان ابن سعود - از سید سردار محمد صاحب حسنی

اچھے گیت - از عبد المجید صاحب بھٹی

خانہ کعبہ کے موجودہ محافظ کی سرگذشت

یعنی

سوانح حیات "سلطان ابنِ سعود"

جس میں پہلی سعودی حکومت کے محیر العقول کارنامے - عرب میں ترکی اور مصری حکومتوں کے اُلجھے ہوئے حالات - خاندان ابن رشد کی المناک سرگذشت - تحریک وہابیت کی تبلیغ و اشاعت، وہابیوں کا جزر و مد - تحریک اخوان کی بنا و تاسیس - سلطان ابن سعود کے عہد بعہد کے حالات و کوائف اور درخشندہ فتوحات - فتح حجاز کے مفصل واقعات - دستور ملکی کا قیام و نفاذ - انتظامات ملکی اصلاحات - علوم و فنون کی ترویج و تشویق - امنیت و مدنیت کے لئے گرانقدر مساعی - نجدی معیشت و معاشرت - مغربی حکومتوں سے تعلقات اور متعدد معاہدات وغیرہ وغیرہ پوری شرح و بسط سے درج ہیں کتاب مستند معلومات کا بے نظیر ذخیرہ ہے - طباعت دیدہ زیب - کاغذ نہایت اعلیٰ ضخامت ۲۶×۲۰/۸ ۲۷۶ صفحہ قیمت ۲ر

ملنے کا پتہ - **مینیجر سلسلہ "مشاہیر اسلام" نمبر ۱۵ جالندھر شہر (پنجاب)**

مسلم انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور

بیمہ زندگی کا کام نہایت کامیابی سے ہو رہا ہے

پنجاب اور یو۔پی کے بڑے بڑے شہروں میں ایجنسیاں قائم ہو چکی ہیں

گارنٹی پر کام کرنیوالے اصحاب تنخواہ پر ملازم رکھے جاتے ہیں

مسلمان خصوصیت کے ساتھ اس کمپنی کی طرف مائل ہو

رہے ہیں

چونکہ یہ ہندوستان کی واحد اسلامی بیمہ کمپنی ہے

اسلئے

ہر سمجھدار مسلمان کو غیر مسلم کمپنیوں کے مقابلہ پر اس کمپنی کو ترجیح دینی چاہیئے

مزید حالات

مینیجنگ ڈائرکٹر کمپنی ہذا سے دریافت

کریں

بقائے صحت کیلئے ایک اچھی دوا

اوکاسا

دماغی کام کرنے والوں کیلئے ایک بہترین چیز ہے

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے
اوکاسا کے استعمال سے جھریاں اور سفید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں
اوکاسا کے استعمال سے اعضائے رئیسہ قوت محسوس کرنے لگتے ہیں
اوکاسا کے استعمال سے اضمحلال، چڑچڑا پن، نیز دوسری اعصابی بیماریاں دُور
ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں

اس سے پہلے کہ

بحالی قوت رفتہ کا وقت گزر جائے "اوکاسا" کا استعمال شروع کر دیجئے

سٹکیوں کا بکس دس روپے آزمایش کیلئے ۳۰ ٹکیاں چار روپے

اوکاسا کے اثرات سے مکمل فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نئی اور تازہ اوکاسا
کی گولیاں استعمال کی جائیں اس کی شناخت یہی ہے کہ تازہ اوکاسا کے ڈبہ پر ایک سرخ فیتہ ہوتا ہے

اوکاسا ہر دوا فروش سے مل سکتی ہے یا ذیل کے پتہ سے بھی منگا سکتے ہیں

اوکاسا کمپنی۔ برلن (انڈیا) لمیٹڈ ریمپرٹ روڈ۔

پوسٹ بکس نمبر ۳۹۷ بمبئی

فن زراعت اور باغبانی پر ایک نہایت مفید کتاب

زمین کی دولت

جس میں زمین اور کھاد کے اقسام۔ پھلوں، پھولوں اور غلوں کے طریقہ ہائے کاشت، ان کی نگرانی، فصلوں کے ہیر پھیر اور دوسرے اہم امور کو نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے

تصنیف

سید انعام اللہ مرحوم مدبر دورِ جدید

کتاب مجلد ہے اور جا بجا عکسی تصاویر اور ضروری نقشوں سے مزین۔ قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک

حیدر آباد ایڈیشن

نفیس جلد، خاندان حضور نظام خلد اللہ ملکہ اور ان کے اعیانِ سلطنت کی تصاویر اور اضافے کے ساتھ باایں ہمہ قیمت میں کوئی فرق نہیں۔ جو نسا ایڈیشن پسند ہو طلب فرمائیے

اور

دو اعلیٰ درجے کے معاشرتی افسانے

ثریّا

مصنفہ

والدہ صاحبہ میر افضل علی

قیمت

۱۲ رفی جلد

اور

مذہب و عشق

مصنفہ

والدہ صاحبہ میر افضل علی

قیمت

۸ رفی جلد

کتاب خانہ طلوع اسلام ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور

شاہنامۂ اسلام

(ہر دو حصص قیمت ہے)

حضرت حفیظ جالندھری کی منظومات و غزلیات

اور ترانوں کا مشہور مجموعہ

سوز و ساز اور نغمہ زار

قیمت عہ — قیمت ہمہ

حفیظ کی دوسری نظمیں

سلام ۲ر — رقاصہ ۲ر — صبح صادق ۴ر — پردہ اور تعلیم ۲ر

اور افسانے

ہفت پیکر اور معیاری افسانے

سات افسانوں کا دلکش مجموعہ

قیمت (عہ)

یعنی دنیا کے اچھے اچھے اور مفید افسانوں کا مجموعہ

قیمت (عہ)

نقش چغتائی

خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی کا شاہکار

قیمت پانچ روپے

مسدس حالی :- صدی ایڈیشن قیمت عہ اور عہ

کتاب خانہ طلوع اسلام - ۲۵ میکلوڈ روڈ - لاہور

آپ کے پڑھنے کی کتابیں

میری کہانی۔

پنڈت جواہرلال نہرو کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح زور بیان۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک بے نظیر کتاب ہے۔ قیمت مجلد صرف چار روپے

میدانِ عمل

ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جوان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت ۴؎

نقش و نگار

یعنی شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی "مدیر کلیم" دہلی کی تازہ ترین وجد آفرین اور پرکیف نظموں کا مجموعہ جو منددجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد ۴؎

شعلۂ طور

حضرت جگر مرادآبادی کا مکمل دیوان۔ قیمت ۳؎

نفسیاتِ شباب

یہ کتاب برلن یونیورسٹی کے پروفیسر اور فلسفہ تعلیم و تمدن کے بے مثل ماہر ایڈورڈ اشپرانگر کی تازہ تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ ہے نوجوانوں کی مجموعہ نفسی سیرت ان کی تخیلی زندگی، انکے عشق، ان کے نصب العین کائنات اور اخلاقی نشو و نما پر نفسیات شباب سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ قیمت صرف تین روپے۔ ۳؎

سیرتِ محمد علی

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کی مفصل و مبسوط سوانحعمری جو رئیس احمد صاحب جعفری نے لکھی تھی مولانا مرحوم کی متعدد تصاویر بھی دی گئی ہیں قیمت ۲؎

کلامِ جوہر

مولانا محمد علی مرحوم کے سارے کلام کا مجموعہ جس کے شروع میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا دیباچہ ہے (طبع رابع) قیمت ۸؎

زادِ راہ۔ منشی پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ

کتاب خانہ طلوع اسلام ۲۵ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

اگر آپ کو

اسلامی تاریخ و تمدن، فلسفہ، مذہب، عمرانیات، ادب عالیہ و افسانہ و تمثیل سے دلچسپی ہے

ادارہ ادبیاتِ ملّیہ

کی رکنیت قبول فرمائیے جس کا نہ کوئی چندہ ہے نہ قواعد صرف اپنا

اسمِ گرامی اور مستقل پتے سے مطلع فرما دیجئے تاکہ تصنیف و تالیف کا جو ہم سلسلہ ہمارے سامنے ہے

اس کے

ماتحت جو کتاب شائع ہو اس کی اطلاع آپ کی خدمت میں کر دی جائے

منتخب افسانے

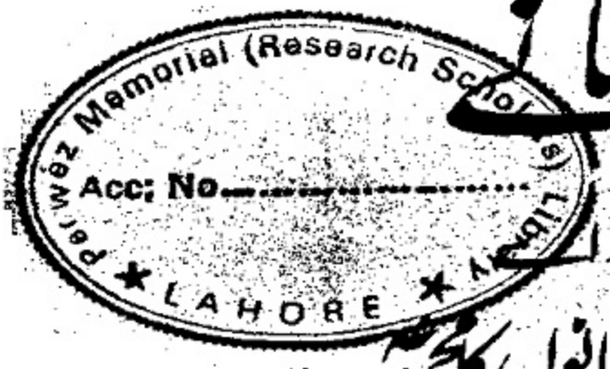

از سید نصیر احمد بی۔ اے

دس سے زیادہ دلآویز افسانوں کا مجموعہ

جسمیں

انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نہایت خوبی سے واضح کیا گیا ہے

زیرِ طبع

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

کتاب خانہ طلوعِ اسلام ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور

RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM

By SIR MUHAMMAD IQBAL

Oxford University Press Edition

Price Rs. 5-10

CONFLICT OF EAST & WEST IN TURKEY

By Mme. Halida Edib Hanoum

PRICE Rs. 2-8

PROGRESSIVE AFGHANISTAN

(BEING A HISTORY OF THE 1928-29 REVOLUTION)

BY PROF. MOHD. ALI OF HABIBIA COLLEGE

PRICE RS. 2-8 PER COPY.

AURANGZEB AND HIS TIMES

BY ZAHIR-UD-DIN, FARUKI, BAR.-AT-LAW

PRICE Rs. 8-8

THIS WORK, THE RESULT OF MANY YEARS OF RESEARCH, UPSETS THE CONCLUSIONS OF OTHER HISTORIANS, ESPECIALLY OF HINDU SCHOLARS

Kitabkhana Tulu'e-Islam, 25, McLeod Rd.,
Lahore

Phone No. 4616 Regd. N

حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہ

کی

جدید فارسی مثنوی

"پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق"

اور

مسافر

Parwez Memorial (Research Scholars) Library
Acc: No. 1550
★ LAHORE ★

یکجا اور مجلد

قیمت عہ/۱۲

کتاب خانہ طلوعِ اسلام، ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور

ملنے

ہاشمی [illegible] والے [illegible]